انسانی فریضہ - مرتبہ - جناب افتخار فریدی صاحب چھوٹی تقطیع کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت۔ تحریر نہیں، صفحات ۶۴، پتہ مصنف سے فریدی بلڈنگ سنبھلی گیٹ مراد آباد،

مصنف تبلیغی جماعت کے ایک ممتاز اور سرگرم کارکن ہیں، اس رسالہ میں انھوں نے تبلیغ و دعوت کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس کو مسلمانوں کا اصلی فریضہ قرار دیا ہے۔ اور موجودہ دور کے ابتر حالات، انسانیت کی تباہی، اخلاقی و ذہنی پستی، مادیت و خدا فراموشی وغیرہ کا ذکر کر کے انسانوں کی صحیح رہنمائی اور دعوت و شہادت علی الناس کے فریضہ کی جانب امت کو توجہ دلائی ہے۔ اور ضمناً تبلیغ و دعوت کے ضروری اصول و آداب اور اتمام حجت کی حقیقت بھی بیان کیگئی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا تھانوی، مولانا آزاد، مولانا احتشام الحسن، مولانا علی میاں اور مولانا امین احسن اصلاحی کی دعوتی و تبلیغی تحریروں کے اقتباسات بھی درج کر دئے ہیں، اس حیثیت سے یہ رسالہ مسلمانوں کے لیے سبق آموز اور بقامت کہتر بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔

پیغام حیات - مرتبہ - جناب ہنس ریکانی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۶۶ قیمت ۔ سے، پتہ ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ پوسٹ باکس ۱۵۳ حیدر آباد، آندھرا پردیش،

پیغام حیات ہندوستان کے چونتیس مسیحی شعراء کے اردو کلام کا مجموعہ ہے، ہر شاعر کے مختصر حالات اور خصوصیات کلام بھی تحریر کیے گئے ہیں ..... اس میں عیسوی مذہب کے عقائد و افکار کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اسی لئے اس کا نام پیغام حیات رکھا گیا ہے مرتب نے حاشیے میں مذہبی اصطلاحی الفاظ کی تشریح و وضاحت کر دی ہے مذہبی حیثیت سے قطع نظر یہ مجموعہ شاعرانہ لطف سے خالی نہیں، اس سے اردو کی غیر فرقہ واریت اس کی ہمہ گیری اور ہر مذہب و ملت میں یکساں مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ (ض)

جلد ۱۱۴ ماہ رجب ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۴ء عدد ۲

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۸۲-۸۴

مقالات

حدیث کا درایتی معیار (داخلی نقد حدیث)	جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۸۵-۱۰۲
اندلس کی عربی شاعری	جناب مولوی شفیق احمد خاں صاحب ندوی ایم اے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۱۰۳-۱۱۹
تاج محل کی تعمیر اور استاد احمد لاہوری (تحقیق مزید کی روشنی میں)	مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے	۱۲۰-۱۳۷
وحشت اور جگر	جناب شعیب عظیم ڈھاکہ	۱۳۸-۱۴۹
کیا بیدل عظیم آبادی نہ تھے؟	جناب احسن الظفر صاحب ریسرچ اسکالر لکھنو یونیورسٹی	۱۵۰-۱۵۷
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۱۵۸-۱۶۰

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مئی مین مجاہد جلیل مفتی امین الحسینی نے انتقال کیا، ان کی پوری زندگی جہاد مسلسل کی ایک داستان ہے، اسرائیل کے قیام کے بعد سے برابر وہ اس کے خلاف جدوجہد میں لگے رہے، فلسطین کا مسئلہ اگرچہ ابتدا سے مسلمانوں کا مذہبی مسئلہ تھا۔ اور انھوں نے اسی وقت سے اس کے خلاف احتجاج شروع کر دیا تھا، لیکن جب تک اسرائیل نے پر و بال نہ نکالے تھے اسکے عواقب و نتائج پر انکی پوری نظر نہ تھی، مفتی صاحب کی دوربین نگاہ نے . . . اسکو محسوس کر لیا تھا، اور انھوں نے پوری دنیاے اسلام کا سفر کر کے مسلمانوں کو اس کے خطرات سے آگاہ اور اس کے مقابلہ پر آمادہ کیا، اس سلسلہ مین وہ ہندوستان بھی آئے تھے، اس لئے اس مسئلہ مین جان ان ہی نے ڈالی تھی، اور اس راہ میں قید و بند جلا وطنی ہر قسم کی مصیبتین جھیلین اور اسی جہاد پر ان کا خاتمہ ہوا۔ ایسی عظیم شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں اس لئے انکی موت تنہا عربون کا نہیں بلکہ پوری دنیاے اسلام کا حادثہ ہے، اللہ تعالےٰ اس مجاہد جلیل کے مدارج بلند فرمائے۔

دوسرا حادثہ سعودی عرب کے سابق ہندوستانی سفیر شیخ انس یسین کی وفات کا ہے، ابھی وہ جوان تھے، لیکن تدبر و معاملہ فہمی میں تجربہ کار بوڑھوں سے کم نہ تھے، وہ مختلف اوقات میں مختلف ملکون کی سفارت پر رہے، آج کل ٹرکی میں سفیر تھے، وہیں کار کے حادثہ میں وفات پائی، ان میں اپنے مذہب و ملت کا بڑا درد تھا، ہندوستان کے اسلامی ادارون سے ان کو خاص دلچسپی تھی، اپنی سفارت کے زمانہ میں متعدد ادارون کو دیکھا اور ان کی مدد بھی کی، دار المصنفین کے بھی محسن تھے، یہان آنے کا وعدہ بھی کیا تھا، مگر ایسے مواقع پیش آتے رہے کہ آنا نہ ہو سکا، دو سال ہوے دار العلوم ندوۃ العلما

کے مدرسہ ثانویہ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے لکھنو آئے تھے تو ان سے ملاقات ہوئی تھی، اللہ تعالےٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

راقم کے لیے تیسرا حادثہ طالب علمی کے زمانہ کے رفیق مولوی حسین حسان صاحب ندوی اڈیٹر پیام تعلیم کی وفات کا ہے، مرحوم درجہ میں مجھ سے دو تین سال نیچے اور غالباً عمر میں بھی اسی قدر چھوٹے تھے، لیکن ہم دونوں عرصہ تک ایک ہی کمرے میں رہے تھے، اس لئے ان سے دوستانہ تعلقات تھے جو آخر تک قائم رہے، اسی زمانہ سے ان مین مضمون نگاری کا ذوق تھا، چنانچہ عشاق عرب کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ جو زمانہ کانپور کے کئی نمبروں میں چھپا تھا، ندوہ سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ چلے گئے، اور وہان تعلیم کے ساتھ مختلف اوقات میں جامعہ کے مختلف شعبون سے انکا تعلق رہا، بچون کا ادب لکھنے میں ان کو خاص ملکہ تھا اسکے وہ صاحب طرز ادیب تھے، برسون بچون کے رسالہ پیام تعلیم کے اڈیٹر رہے اور اسکو انکا بڑا مقبول رسالہ بنا دیا، پیام تعلیم کے مضامین کے علاوہ انھوں نے بچوں کے ذوق کی بہت سی کتابیں لکھین اور بچکانہ ادب کا بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا، ان سے تعلقات کا سلسلہ برابر قائم رہا، کبھی کبھی ملاقات بھی ہو جاتی تھی، گذشتہ دسمبر مین دلی میں ملاقات ہوئی تھی کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے،

ہندوستان کی آزادی کے بعد سے ایک خاصے بڑے طبقہ میں یہ ذہنیت پیدا ہو گئی ہو کہ ہندوستان کے قرون وسطیٰ اور جنگ آزادی کی تاریخ سے مسلمانوں کا نام مٹا دیا جائے یا کم سے کم انکی بڑی تاریک تصویر پیش کیجائے چنانچہ اس سلسلہ مین مسلمانون کے کارنامون اور انکی قربانیوں کا ذکر اور ان کے ان لیڈروں کا نام تک مشکل سے آنے پاتا ہے جنھوں نے تحریک آزادی میں جان ڈالی تھی، حالانکہ انھوں نے اس زمانہ میں آزادی کا علم بلند کیا جب ہندوستان میں اسکا احساس بھی پیدا نہ ہوا تھا، اور حضرت سید احمد شہید اور مولانا

محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے وقت سے لیکر ہندوستان کی آزادی تک اسکا مسلسل سلسلہ قائم رہا، ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں اگرچہ ہندو مسلمان دونوں شریک تھے لیکن اسکے اصل قائد و رہنما مسلمان ہی تھے اور اسکا خمیازہ سب سے زیادہ ان ہی کو بھگتنا پڑا، ترک موالات کی تحریک میں بھی وہ پیش پیش تھے، اس راہ میں ان کی قربانیاں کسی سے کم نہیں ہیں محض ہندوستان کی تقسیم کے الزام میں ان کے کارنامے فراموش نہیں کئے جا سکتے پھر یہ بھی ایک بحث طلب مسئلہ ہے کہ اس تقسیم کے حقیقی اسباب کیا تھے، اور اس کی ذمہ داری کس پر ہے محض مسلم لیگ کے نعرے سے اتنا بڑا انقلاب نہیں ہو سکتا تھا، اس نے تو صرف ان اسباب سے فائدہ اٹھایا، دوسرے لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی دوسری تنظیمیں آخر تک تقسیم کے خلاف رہیں، اگر کانگریس نے جلد بازی سے کام نہ لیا ہوتا تو تقسیم کی نوبت نہ آتی اور اب تو خود منصف مزاج ہندو اہل قلم تک حقیقت کے چہرہ سے پردہ ہٹا رہے ہیں،

اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ خود مسلمانوں کو جنگ آزادی کی تاریخ لکھنی چاہئے اور اسمیں مسلمانوں کا حصہ پوری طرح دکھانا چاہئے اسکی ذمہ داری جامعہ ملیہ اور اسکے بعد مسلم یونیورسٹی پر عائد ہوتی ہے، جامعہ تو جنگ آزادی میں مسلمانوں کی شرکت کی زندہ یادگار ہے اس کام کیلئے پروفیسر ہارون خان شروانی، ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر خلیق نظامی کی طرف نگاہ اٹھتی ہے، اول الذکر دونوں بزرگ جنگ آزادی کے عینی شاہد ہیں، مگر اب وہ عمر کی اس منزل کو پہنچ گئے ہیں کہ خود اس کام کو انجام نہیں دے سکتے ہیں لیکن انکی نگرانی میں ہو سکتا ہے اور ادارہ اسلام اور عصر جدید کے دائرہ میں بھی یہ کام آجاتا ہے، خلیق احمد صاحب نظامی نامور صاحب علم و قلم اور پختہ کار مصنف ہیں لیکن افسوس ہے کہ انکے علمی ذوق کو پرو وائس چانسلری کے چکر نے غارت کر دیا انکا اصلی مقام تعلیم و تدریس اور تالیف و تصنیف کی مسند تھی چانسلری اور پرو وائس چانسلری کا خار زار نہیں مسلم یونیورسٹی کو وائس چانسلر بہت مل جائیں گے مگر خلیق احمد نظامی جیسا صاحب علم و قلم کا ملنا آسان نہیں کاش وہ اسپر غور کرتے ع تو بہار عالم دیگری زکجا بہ این چمن آمدی۔

مقالات

حدیث کا درایتی معیار

(داخلی نقد حدیث)

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۴)

رسول اللہؐ کی طرف منسوب حدیث حکمت و اخلاق کے اصول کے خلاف ہو

(۱۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث حکمت و اخلاق کے عام اصول کے خلاف ہو۔

ان یکون مخالفا للقواعد العامۃ فی الحکم والاخلاق [۱]　—　حدیث حکمت و اخلاق کے عام قواعد کے خلاف ہو۔

ابن جوزی کہتے ہیں :-

او ینا قض الاصول [۲]　—　یا حدیث اصول کو توڑنے والی ہو،

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پاتی ہیں :-

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں

افضل الناس اعقل الناس [۳]　—　لوگوں میں سب سے افضل وہ لوگ ہیں جو عقل میں افضل ہیں،

انما یرتفع العباد غدا فی الدرجات و ینالون الزلفی　—　بندے کل (آخرت میں) اللہ کا قرب اور بلند درجات اپنے عقل کے مقدار سے

---

[۱] مصطفےٰ سباعی۔ السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن [۲] ابن جوزی۔ کتاب الموضوعات کتاب التوحید باب فی ان اللہ عز و جل قدیم، [۳] موضوعات کبیر فصل اول وحاشیہ بر الخ ص ۱۰۵

من رابهم علی قدر عقولهم[1] ... حاصل کریں گے۔

شرار کم معلموا صبیانکم واقلهم رحمة علی الیتیم واغلظهم علی المسکین[2]

بچوں کے معلم تم میں زیادہ برے ہیں یتیموں پر بہت کم مہربان اور مسکینوں پر زیادہ سخت ہیں،

النظرة الی المرءة الحسناء یزید فی البصر[3]

خوبصورت عورت کی طرف دیکھنے سے بصارت بڑھتی ہے،

لا یصح المکر والخدیعة الا فی النکاح[4]

مکر اور دھوکا نکاح کے علاوہ اور کسی میں درست نہیں ہے۔

لو اغتسل اللوطی بماء البحر لم یجئ یوم القیمة الا جنبا[5]

(فعل قوم لوط کرنے والا) اگر سمندر کے پانی سے بھی غسل کرے جب بھی وہ قیامت کے دن (ناپاک ہی اٹھے گا)

السخی حبیب الله ولو کان فاسقا والبخیل عدو الله ولو کان راهبا[6]

سخی اللہ کا دوست ہے اگرچہ فاسق ہو اور بخیل اللہ کا دشمن ہے اگرچہ عابد و زاہد ہی ہو،

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

کانت عندی امرءة تسمعنی فدخل رسول الله صلی الله علیه وسلم وهی علی تلک ثم دخل عمر

میرے پاس ایک عورت (گانا) سنا رہی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، وہ بدستور سناتی رہی، پھر حضرت عمرؓ آئے

۱ موضوعات کبیر فصل اول و ماهی به ضد ۲ ایضاً حرف الشین ۳ قاضی شوکانی۔ الفوائد المجموعة فی الاحادیث الموضوعة کتاب الادب والزهد ۴ ایضاً کتاب النکاح ۵ علامہ سخاوی۔ المقاصد الحسنة حرف اللام ۶ موضوعات کبیر حرف الکاف

فضحك صلی الله علیه وسلم فقال ما یضحکک یا رسول الله فحدثه فقال والله لا اخرج حتی اسمع ما سمع صلی الله علیه وسلم فاسمعته[1]

تو وہ بھاگ گئی، اس پر رسول اللہ کو ہنسی آگئی، حضرت عمرؓ نے ہنسی کی وجہ پوچھی، آپ نے عورت کے گانا سنانے اور بھاگ جانے کا واقعہ سنایا تو حضرت عمرؓ نے کہا خدا کی قسم میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک میں وہی نہ سن لوں جو رسول اللہ صلعم کو سنا رہی تھی، پھر عورت نے حضرت عمرؓ کو سنایا۔

رتن ہندی سے منقول ہے:-

کنت فی زفاف فاطمة علی فی جماعة من الصحابة فکان ثمة من یغنی نطابت قلوبنا ورقصنا فلما کان الغد سألنا رسول الله صلی الله علیه وسلم عن لیلتنا فاله ینکر علینا ودعا لنا[2]

میں صحابہؓ کی ایک جماعت کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کی شب زفاف میں موجود تھا، اس موقع پر ایک گانے والا موجود تھا، اور ہمارے دل اس قدر مسرور تھے کہ ہم لوگوں نے رقص کیا، دوسرے دن رسول اللہ سے گذشتہ رات کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کوئی نکیر نہیں کی اور ہمارے لیے دعا کی۔

رسول اللہؐ کی طرف منسوب حدیث شہوت و فساد کی داعی ہو

(۱۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث شہوت و فساد کی رغبت دلاتی ہو:

او داعیا الی الشهوة والمفسدة[3]

یا حدیث شہوت و فساد کی داعی ہو،

۱ محمد طاہر فتنی: تذکرة الموضوعات باب السماع والسوق ۲ ایضاً باب فیمن ادعی الصحبة کذبا ۳ الحاج مصطفیٰ سباعی: السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن۔

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی حدیثیں موضوع ہوں گی،

شهوة النساء تضاعف على شهوة الرجال۔[1]	عورتوں کی شہوت مردوں کی شہوت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے،

حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول بھی نقل کیا جاتا ہے:۔

فضلت المرأة على الرجل تسعة وتسعين من اللذة ولكن الله القى عليهن الحياء[2]	عورتوں کو مردوں پر لذت میں ننانوے درجہ فضیلت حاصل ہے، لیکن اللہ نے ان پر حیا کا پردہ ڈال دیا ہے،
عقولهن في فروجهن۔[3]	عورتوں کی عقلیں انکی شرمگاہوں میں ہیں
شكوت الى جبريل ضعفي من الوقاع فامرني باكل الهريسة[4]	میں نے جبریل سے ضعف باہ کی شکایت کی تو انھوں نے حریرہ کھانے کا حکم دیا،
قال معاذ هل اتيت من الجنة بطعام قال نعم اتيت بهريسة فاكلتها فزادت في قوتي قوة اربعين وفي نكاحي اربعين	معاذؓ نے کہا کہ کیا آپ جنت سے کوئی کھانا لائے ہیں، آپنے فرمایا ہاں حریرہ لایا ہوں، میں نے اس کو کھایا تو میری قوت میں چالیس مردوں کی قوت کا اضافہ اور میری شہوت میں چالیس عورتوں کی شہوت کا اضافہ ہوا،
وكان معاذ لا يعمل طعاما الا بدأ بالهريسة[5]	معاذؓ ہر کھانے سے پہلے حریرہ استعمال کرتے تھے۔
ان الرجل ليجامع فيكتب له	انسان اپنی عورت سے جماع کرتا ہے

۱ تذکرۃ الموضوعات فصل تادیب النساء، الخ ۲،۳ المقاصد الحسنۃ باب العین ۴ تذکرۃ الموضوعات فصل الادام کاللحم والہریسۃ ۵ ایضا

اجر ولد ذكر قاتل في سبيل الله فقتل۔[1]	تو اسکو ایسے لڑکے کا اجر ملتا ہے جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا پھر شہید ہوگیا،
ما من رجل من المسلمين يأخذ بيد امرأته يراودها الا كتب الله له عشر حسنات فاذا عانقها فعشرون حسنة فاذا قبلها فعشرون ومائة حسنة فاذا جامعها ثم قام الى مغتسله لم يمر الماء على شعرة من جسده الا كتب له بها عشر حسنات وحط عنه عشر خطيئات وان الله عز وجل ليباهي به الملائكة فيقول انظروا الى عبدي قام في هذه الليلة الشاتية بردها فاغتسل من الجنابة مومنا الى ربه اشهدكم اني قد غفرت له۔[2]	کوئی مسلمان نفسانی تقاضے کے تحت اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑتا ہے تو اس کو دس نیکیاں ملتی ہیں، جب معانقہ کرتا ہے تو بیس ملتی ہیں، جب بوسہ لیتا ہے تو ایک سو بیس اور جب جماع کرتا اور اس کے بعد غسل کرتا ہے تو اس کے بدن کے جس بال سے بھی پانی گذرتا ہے اس کے بدلہ دس نیکیاں ملتی اور دس گناہ دور کیے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ میرے بندہ کو دیکھو کہ سردی کی رات میں اس نے غسل جنابت کیا اور ایمان کے ساتھ اپنے رب کے حضور حاضر ہوا تو تم گواہ رہو کہ میں نے اس کو بخش دیا۔

۱ قاضی شوکانی: الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ کتاب النکاح ۲ جلال الدین السیوطی: اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ کتاب النکاح ج ۲ ص ۹۳۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث قواعد طب کے خلاف ہو

(۱۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث قواعد طب کے خلاف ہو۔

او یکون مخالفا لقواعد الطب المتفق علیها[1] — یا حدیث طب کے متفقہ قواعد کے خلاف ہو۔

ابن قیم اور ملا علی قاری نے زیادہ وسعت سے کام لیکر یہ تعبیر اختیار کی ہے:

ان یکون الحدیث بوصف الاطباء والطرقیه اشبه والیق[2] — حدیث اطباء اور چٹکلا بازوں کے بیان کے زیادہ مشابہ اور لائق ہو

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی:-

الباذنجان شفاء من کل داء[3] — بیگن میں ہر بیماری کی شفاء ہے

فضل الکراث علی البقول کفضل الخبز علی سائر الاشیاء[4] — "گندنا" کی فضیلت سبزیوں پر ایسی ہی ہے جیسی روٹی کی فضیلت تمام چیزوں پر ہے۔

یا علی علیك بالملح فانه شفاء من سبعین داء الجذام والبرص والجنون[5] — اے علی! نمک کو استعمال کرو، اس میں ستر بیماریوں کی شفاء ہے، جذام برص اور جنون۔

---

[1] مصطفےٰ سباعی: السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن

[2] المنار المنیف فصل ۴۰، موضوعات کبیر ص ۱۰۵ [3] علامہ سخاوی المقاصد الحسنة حرف الباء

[4و5] جلال الدین سیوطی: اللآلی المصنوعة فی الاحادیث الموضوعة کتاب الاطعمة

من اکل القثاء باللحم وقی الجذام[1] — جس شخص نے ککڑی کو گوشت کے ساتھ کھایا وہ جذام سے محفوظ رہا۔

اللحم ینبت اللحم من ترك اللحم اربعین یوما ساء خلقه[2] — گوشت گوشت کو اگاتا ہے جس نے چالیس دن گوشت کھانا چھوڑ دیا اس کے اخلاق وعادات خراب ہو گئے۔

الشرب من فضل وضوء المومن فیه شفاء سبعین داء[3] — مومن کے وضوء کا بچا ہوا پانی پینے سے ستر بیماریوں کی شفاء ہوتی ہے۔

قواعد طب کے موافق حدیثوں کی حیثیت

طب سے متعلق جو روایتیں قواعد طب کے خلاف نہیں ہیں انکا سرچشمہ نہ شعور نبوت ہے اور نہ وہ رسالت کے فرائض منصبی میں داخل ہیں، چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ نے ایسی روایتوں کو دوسری قسم کی روایتوں میں شمار کیا ہے،

وثانیهما لیس من باب تبلیغ الرسالة...... فمنه الطب[4] — دوسری وہ روایتیں ہیں جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے نہیں ہے، ان ہی میں طب ہے۔

اس قسم کی روایتوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے:

انما انا بشر اذا امرتکم بشیء — میں صرف ایک بشر ہوں، جب تمھارے

---

[1] تذکرة الموضوعات باب الادام کاللحم [2] جلال الدین سیوطی۔ اللآلی المصنوعة فی الاحادیث الموضوعة کتاب الاطعمة [3] قاضی شوکانی، الفوائد المجموعة فی الاحادیث الموضوعة کتاب الاطعمة

[4] شاہ ولی اللہ: حجة اللہ البالغة ج ۱ باب اقسام علوم النبی صلعم۔

من دینکم فخذوا به واذا امرتکم بشئ من رائی فانما انا بشر [۱]

دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو سمجھو کہ میں بشر ہوں

غالباً اسی بنا پر ابن قیم اور ملا علی قاری نے ان کو حدیث میں شامل کرنا پسند نہیں کیا۔

رسول اللہؐ کی طرف منسوب حدیث تاریخی حقائق کے خلاف ہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث تاریخی حقائق کے خلاف ہو۔

مخالفته لحقائق التاریخ المعروفة فی عصر النبی صلی اللہ علیہ وسلم [۲]

یا حدیث تاریخی حقائق کے خلاف ہو جو رسول اللہ کے زمانہ میں مشہور تھے۔

ابن قیم کہتے ہیں

ومنها ما یقترن بالحدیث من القرائن التی یعلم انه باطل [۳]

حدیث میں تاریخی قرائن ایسے پائے جائیں جس سے معلوم ہو جائے کہ وہ باطل ہے۔

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی۔

ان النبی وضع الجزیة علی اهل خیبر ورفع عنهم الکلفة والسخرة بشهادة سعد بن معاذ

رسول اللہؐ نے خیبر والوں سے جزیہ معاف کر دیا، کلفہ اور بیگار کو بھی معاف کر دیا، اس کے شاہد سعد بن معاذ

---

[۱] شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ باب اقسام علوم النبی صلعم [۲] مصطفی سباعی: السنۃ ومکانتها فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن [۳] ابن قیم المنار المنیف فصل ۲۶

وکتابة معاویة [۱]

اور کاتب معاویہ ہیں،

یہ روایت ان وجوہ سے باطل ہے،

(۱) جس وقت اہل خیبر (۷ھ) سے معاہدہ ہوا، اس وقت تک جزیہ کا حکم نہیں نازل ہوا تھا، قرآن حکیم میں جزیہ کا حکم غزوہ تبوک (۹ھ) کے بعد نازل ہوا۔

(۲) اس میں سعد بن معاذ کی گواہی ہے حالانکہ ان کی وفات غزوہ خندق (۵ھ) کے ایک ماہ بعد ہو چکی تھی،

(۳) اس کے کاتب حضرت معاویہؓ ہیں، حالانکہ اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے، فتح مکہ کے بعد وہ اسلام لائے،

(۴) اس میں بطور نشان کلہ (سر پر باندھنے کی پٹی) اور بیگار کا ذکر ہے، حالانکہ اس زمانہ میں نہ یہ نشان تھا اور نہ بیگار لیا جاتا تھا،

حضرت انسؓ سے روایت ہے:

دخلت الحمام فرأیت رسول اللہ جالسا وعلیه مئزر فهممت ان اکلمه فقال یا انس حرمت دخول الحمام بغیر مئزر من اجل هذا [۱]

میں حمام میں گیا تو رسول اللہ کو اس میں تہبند باندھے ہوئے بیٹھا پایا، میں نے آپ سے گفتگو کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ اے انس میں نے اسی وجہ سے بغیر تہبند کے حمام میں داخل ہونے کو حرام کیا ہے

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ حمام تشریف لے جانا ثابت ہے اور نہ اس وقت حمام کے رواج کا ثبوت ملتا ہے۔

---

[۱] السنۃ ومکانتها فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن [۲]

بعض روایتوں میں ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ بن اُبی کے ساتھیوں اور رسول اللہ کے صحابہ کے درمیان جھگڑا ہو گیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1]

وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا[2]	اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان میں صلح کرا دو۔

حالانکہ جس وقت آیت نازل ہوئی ہے اس وقت تک عبداللہ اور اس کا گروہ ظاہر میں بھی مسلمان نہ تھا جبکہ قرآن میں مومنوں کے دو گروہ کا ذکر ہے، اس بنا پر آیت کا شان نزول یہ واقعہ نہیں ہو سکتا،

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث کے خلاف صحیح شواہد موجود ہوں

(۱۷) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث کے خلاف صحیح شواہد ایسے موجود ہوں جن سے اس کا باطل ہونا ظاہر ہوتا ہو۔

ان يكون الحديث مما تقوم الشواهد الصحيحة على بطلانه[3]	حدیث ایسی ہو کہ اس کے بطلان پر صحیح شواہد موجود ہوں،

ملا علی قاری کی بھی یہی عبارت ہے،[4]

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی،

عوج بن عنق کے بارے میں ہے:۔

ان طوله ثلاثة الاف ذراع وثلاث مائة وثلاثة وثلثين	عوج بن عنق (جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کر دیا تھا) کا قد تین ہزار تین سو تینتیس

---

[1] زمخشری: تفسیر کشاف سورہ حجرات [2] القرآن: حجرات رکوع ۱ [3] ابن قیم: المنار المنیف فصل ۱۷
[4] موضوعات کبیر ص ۱۱۶

وثلثا[1]	اور ثلث ذراع تھا

حضرت آدمؑ کے بارے میں ہے کہ:

خلق الله آدم طوله ستون ذراعا فلم يزل الخلق ينقص بعد[2]	اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو ان کا قد ستر ذراع تھا، پھر اس کے بعد اولاد آدم کا قد اب تک کم ہوتا رہا،

کوہ قاف کے بارے میں ہے:۔

ان قاف جبل من زبرجدة خضراء تحيط بالدنيا كاحاطة الحائط في البستان والسماء واضعة اكنافها عليه فزرقتها منه[3]	کوہ قاف سبز زمرد کا ہے جو دنیا کو ایسے ہی محیط ہے جیسے چہار دیواری باغ کو محیط ہوتی ہے اور آسمان اپنے کناروں کو اس پر رکھے ہوئے ہے آسمان کی نیلگونی اسی وجہ سے ہے۔

زمین کے استقرار کے بارے میں ہے

ان الارض على صخرة والصخرة على قرن ثور فاذا حرك الثور قرنه تحركت الصخرة فتحركت الارض وهي الزلزلة[4]	زمین چٹان پر ہے اور چٹان بیل کی سینگ پر، جب بیل اپنی سینگ کو حرکت دیتا ہے تو چٹان کو حرکت ہوتی ہے، پھر زمین کو حرکت ہوتی ہے، اسی کا نام زلزلہ ہے،

رتن ہندی کے بارے میں ہے:۔

---

[1] المنار المنیف فصل ۱۷ و موضوعات کبیر ص ۱۱۷ [2] ایضاً فصل ۱۶ و ۱۷ [3] و [4] ملا علی قاری: موضوعات کبیر ص ۱۱۸

عاش ست مائة سنة وثلاثين سنة [1]

کہ وہ چھ سو تیس سال تک زندہ رہا

رتن ہندی سے بہت سی نہایت لغو قسم کی روایتیں مروی ہیں، وہ سب موضوع ہیں،[2]

ابن عمرؓ کہتے ہیں:-

سمعت رسول الله صلی الله علیہ وسلم یقول ان بعض اوصیاء عیسیٰ بن مریم حی بالعراق فاذا انت رأیتہ فاقرئہ منی السلام [3]

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ عیسیٰ بن مریم کے "بعض" "وصی" عراق میں زندہ ہیں جب ان کو دیکھو میرا سلام کہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے "بعض" حوارین کی زندگی اور ان سے ملاقات کے بارے میں مختلف روایتیں آتی ہیں لیکن وہ سب موضوع اور باطل ہیں،[4]

مذکورہ ساری باتیں اللہ کی عادت (سنۃ اللہ) وحقیقت کے خلاف ہیں۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث اللہ کی تنزیہ وکمال کے خلاف ہو

(۱۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث اللہ تعالیٰ کی تنزیہ وکمال کے خلاف ہو،

او مخالفا لما یوجبه العقل لله من تنزیه وکمال [5]

"عقل" اللہ کے لیے جو تنزیہ وکمال واجب کرتی ہے حدیث اسکے خلاف ہو۔

---

۱ تذکرۃ الموضوعات باب فیمن ادعی الصحبۃ کذبا ۲ ایضاً ۳ جلال الدین سیوطی: اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ کتاب الانبیاء والقدماء ۴ ایضاً ۵ مصطفیٰ سباعی: السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن

اس اصول کے تحت موضوع حدیثیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی،

ان الله خلق الفرس فاجراها فعرقت فخلق نفسه منها [1]

اللہ نے گھوڑے کو پیدا کیا، اس کو دوڑایا وہ پسینہ پسینہ ہوگیا، اس سے اپنی ذات کو پیدا کیا،

دوسری روایت میں لوگوں نے آپ سے یہ سوال کیا

مما ربنا قال من ماء مرور لا من ارض ولا سماء خلق خيلا فاجراها فعرقت فخلق نفسه من ذلك العرق [2]

ہمارا رب کس چیز سے پیدا کیا گیا، آپ نے فرمایا گذرے ہوئے پانی سے نہ زمین سے نہ آسمان سے، گھوڑے کو پیدا کیا، اس کو دوڑایا وہ پسینہ پسینہ ہوگیا، اس پسینہ سے اپنی ذات کو پیدا کیا،

العیاذ باللہ کس قدر مہمل یہ روایتیں ہیں:

ان بين الله وبين الخلق سبعين الف حجاب واقرب الحجب الى الله جبريل وميكائيل واسرافيل وان بينهم وبينه اربعة حجب حجاب من نار وحجاب

اللہ اور مخلوق کے درمیان ستر ہزار پردے ہیں، پردوں میں زیادہ قریب جبریل، میکائیل اور اسرافیل ہیں، ان کے درمیان اور اللہ کے درمیان چار پردے ہیں (۱) آگ کا پردہ (۲) تاریکی کا پردہ

---

۱ مصطفیٰ سباعی: السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن ۲ ابن عراق: الموضوعات (مخطوطہ) کتاب التوحید

من ظلمة وحجاب من غمام — (۳) ابر کا پردہ اور (۴) پانی
وحجاب من الماء [1] — کا پردہ،
كنت كنزاً مخفياً لا اعرف — میں پوشیدہ خزانہ تھا جس کو کوئی پہچانتا نہ تھا
فاحببت ان اعرف فخلقت — میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو مخلوق کو پیدا کیا
خلقاً فعرفتهم بي فعرفوني [2] — میں نے ان کو اپنی نسبت سے پہچانا، انھوں نے مجھکو پہچانا،

ان الله عزوجل يجلس يوم — اللہ تعالی قیامت کے دن بیچ کے
القيمة على القنطرة الوسطى — پل پر بیٹھے گا جو جنت اور دوزخ
بين الجنة والنار [3] — کے درمیان ہے،
ان الله عزوجل ينزل في كل — اللہ تبارک و تعالی ہر جمعہ کی رات دار دنیا
ليلة جمعة الى دار الدنيا — کی دنیا کی طرف چھ ہزار فرشتوں کے
في ستمائة الف ملك فيجلس — درمیان نزول اجلال فرماتا ہے، نور
على كرسي من نور وبين يديه — کی کرسی پر بیٹھتا ہے اور اس کے آگے
لوح من ياقوت حمراء فيه — یاقوت کی تختی ہوتی ہے جس میں امت محمدیہ
اسماء من يثبت الرؤية — کے ان لوگوں کے نام ہوتے ہیں جن کی
والكيفية والصورة من امة — رویت صورت اور کیفیت ثابت ہے
محمد نبيا ويباهي بهم الملائكة — اور فرشتوں سے فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ
ويقول تبارك وتعالى هؤلاء — یہ میرے بندے ہیں جنھوں نے میرا انکار

---

[1] ابن جوزی: العلل المتناہیہ فی الاحادیث الموضوعہ (مخطوطہ) باب ذکر الصورۃ [2] تذکرۃ الموضوعات کتاب التوحید [3] السیوطی: اللآلی المصنوعہ کتاب التوحید

عبيدي الذين لم يجحدوني — نہیں کیا اور میرے نبی کی سنت قائم کی
واقاموا سنة نبيي ولم يخافوا في — اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے
الله لومة لائم اشهدكم يا ملائكتي — کی پروا نہیں کی، اے فرشتو میں تمھیں
وعزتي وجلالي لادخلنهم — گواہ بناتا ہوں میری عزت وجلال کی
الجنة بغير حساب [1] — قسم میں انکو جنت میں بغیر حساب داخل کرونگا۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث صراحت قرآن کے خلاف ہو

(۱۹) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث صراحت قرآن کے خلاف ہو۔

مخالفة الحديث صريح القرآن [2] — حدیث صریح قرآن کے خلاف ہو
مخالفة لصريح القرآن بحيث — حدیث کی مخالفت صریح قرآن کی
لا يقبل التاويل [3] — اس طرح ہو کہ تاویل قبول کرے،

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی۔

لا يدخل الجنة ولد زنا ولا — ولد الزنا اور اس کی نسل سے سات
بشيء من نسله الى سبعة — پشت تک کوئی شخص جنت میں
اباء الجنة [4] — نہ جائے گا۔
يحشر اولاد الزنا في صورة — قیامت کے دن ولد الزنا، بندر
القردة والخنازير [5] — اور خنزیر کی شکل میں جمع کیے جائیں گے

ایسی روایتیں قرآن حکیم کی اس آیت کے خلاف ہیں،

---

[1] اللآلی المصنوعہ کتاب التوحید [2] المنار المنیف فصل ۱۸ [3] مصطفے سباعی: السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن [4-5] محمد طاہر پٹنی: تذکرۃ الموضوعات حدود الردۃ والزنا الخ

وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی[1] — کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائیگا۔

دنیا کی عمر کے بارے میں ہے:

انها سبعة آلاف سنة ونحن فی الألف السابعة[2] — دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے اور ہم ساتویں ہزار سال میں ہیں۔

یہ قرآن حکیم کی ان آیتوں کے خلاف ہے جن میں کہا گیا ہے کہ قیامت کا علم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا مثلاً

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ[3] — لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ اس (قیامت) کا وقوع کب ہوگا، آپ کہہ دیجئے کہ اس کا علم میرے رب کے پاس ہے، وہی اس کے وقت پر ظاہر کرے گا۔

دوسری جگہ ہے

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ[4] — بیشک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے

زمین وغیرہ کی پیدائش کے بارے میں ہے

خلق الله عز وجل التربة يوم السبت وخلق فيها الجبال يوم الاحد وخلق الشجر يوم الاثنين وخلق المكروه يوم الثلاثاء وخلق النور يوم الاربعاء — اللہ نے زمین کو ہفتہ کے دن، پہاڑ کو اتوار کے دن، درخت کو دوشنبہ کے دن، ناپسندیدہ چیزوں کو منگل کے دن، نور کو بدھ کے دن پیدا کیا، جانوروں کو اس میں جمعرات کے دن پھیلایا اور

[1] القرآن: سورہ الانعام رکوع ۲۰ [2] ملا علی قاری: موضوعات کبیر فصل ومنها مخالفة الحديث الخ
[3] الاعراف رکوع ۲۳ [4] سورہ لقمان رکوع ۴

وبث فيها الدواب يوم الخميس وخلق آدم عليه السلام بعد العصر من يوم الجمعة فی آخر الخلق فی آخر ساعة من ساعات الجمعة فيما بين العصر الى الليل[1] — آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن عصر کے بعد پیدا کیا، آدم کی پیدائش آخری تھی وہ جمعہ کے دن آخری ساعت میں عصر و مغرب کے درمیان ہوئی

اس میں پیدائش کی مدت سات دن ہے، جبکہ قرآن حکیم میں ست تخلیق چھ دن (دور) بیان کی گئی ہے۔

خلق السموات والارض فی ستة ايام[2] — اللہ نے آسمان و زمین کو چھ دن (دور) میں پیدا کیا۔

پھر اس میں آسمان کی پیدائش کا ذکر نہیں ہے، صرف زمین اور اس کی چیزوں کو سات دن میں پیدا کرنے کا ذکر ہے، جبکہ قرآن حکیم میں ہے کہ زمین اور اس کی چیزیں چار دن (دور) اور آسمان دو دن (دور) میں پیدا کیے گئے،[3]

یہ در اصل کعب احبار کا قول ہے، جس کو غلطی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔[4]

(۲۰) رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث سنت صریحہ کو توڑنے والی ہو | رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث سنت صریحہ کو کھلم کھلا توڑنے والی ہو۔

[1] مسلم: کتاب صفات المنافقین باب ابتداء خلق [2] الاعراف ۔ ۷ [3] حم سجدہ ۲۔ [4] بخاری
تاریخ کبیر و موضوعات کبیر ص ۱۲۰

مناقضة الحدیث لما جاءت بہ السنة الصریحة مناقضةً بینةً[1]	حدیث ان باتوں کو کھلم کھلا توڑنے والی ہو جو سنت صریحہ سے ثابت ہوں،

اس اصول کے تحت درج ذیل دو قسم کی حدیثیں موضوع قرار پائیں گی۔

(۱) وہ جو فساد، ظلم فعل عبث، باطل کی تعریف اور حق کی برائی پر مشتمل ہوں۔

(۲) وہ جنمیں نام والقاب کی اسقدر اہمیت بیان کیگئی ہو کہ اس سے ایمان وعمل صالح کی اہمیت مجروح ہوتی ہو۔

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں | چند روایتیں یہ ہیں :۔

لو یربی احدکم بعد الستین ومأئة جرو کلب خیر لہ من ان یربی ولدا[2]	ایک سو ساٹھ سال کے بعد کوئی کتے کے پلہ کی پرورش کرے اس سے بہتر ہے کہ وہ اولاد کی پرورش کرے۔
لا یولد بعد ست مائة مولود وللہ فیہ حاجة[3]	چھ سو سال کے بعد کوبچہ نہ پیدا ہوگا کہ اللہ کی اس میں حاجت باقی رہے۔
ان الناس یوم القیمة یدعون بامھاتھم لا باٰبائھم[4]	لوگ قیامت کے دن اپنی ماؤں کے نام کے ساتھ پکارے جائیں گے، باپ کے نام کے ساتھ نہیں۔
اذا دعت احدکم امہ وھو فی الصلوٰة فلیجب واذا دعاہ ابوہ فلا یجب[5]	اگر کسی شخص کی ماں اسوقت بلائے جبکہ نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے پاس جائے اور باپ بلائے تو نہ جائے۔
اذا اتت من امتی ثلاث مائة وثمانون سنة فقد حلت لھم العزبة والترھب علی رؤس الجبال[6]	جب میری امت پر تین سو اسی سال گذر جائیں تو ان کے لیے مجرد رہنا اور پہاڑوں کی چوٹی پر رہبانیت اختیار کرنا حلال ہے۔
ان الصلوٰة فیہ بخمسین الف صلوٰة[7]	بیت المقدس میں نماز پچاس ہزار نماز کے برابر ہے۔

نام والقاب سے متعلق فضیلت کی حدیثیں کہ جس سے عمل کی اہمیت مجروح ہوتی ہو اصول ۹ میں گذر چکی ہیں، یہ سب سنت صریحہ کے خلاف ہیں۔

۲۰

[1] ابن قیم: المنار المنیف فصل ۹ [2] موضوعات کبیر صفحہ ۱۲۶ [3] ایضاً [4] المنار المنیف فصل ۵ [5] ایضاً ۴۹ [6] ایضاً ۳۰ [7] ایضاً

اندلس کی عربی شاعری

از

جناب شفیق احمد خانصاحب ندوی ایم اے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

تعارف اندلس سے مراد مسلم اسپین ہے جسے اہل روم کبھی ہسپانیہ اور اہل یونان ایبیریا کہتے تھے۔ یعنی براعظم یورپ کا وہ خوبصورت ہر سبز وشاداب اور وسیع وعریض جزیرہ نما جسے طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر جیسے اولوالعزم سپہ سالاروں نے ۹۱ھ میں فتح کیا اور بڑے تزک واحتشام کے ساتھ اس اموی خلافت کا پرچم لہرایا جو دمشق میں بانی خلافت عباسیہ ابوالعباس (مشہور زمانہ سفاح) کے ہاتھوں تہس نہس ہوچکا تھا، یہ حکومت اس ہرے بھرے جزیرہ نما میں ۱۴۹۲ء تک شاہانہ فرماں روائی کرتی رہی،

تسمیہ اندلس جس کے ایک طرف کوہ کلبہ (جبل الطارق) اور تین طرف بحر زقاق نامی نیلگوں سمندر موجیں مارتا ہے، ہمیشہ سے اہل علم کی توجہ کا مرکز رہا ہے، یہ مسئلہ کہ عربوں نے اسپین سے متعلق اپنے تمام مفتوحہ علاقوں کو اندلس ہی کے نام سے کیوں موسوم کیا؟ یہ اہل تاریخ کے درمیان زیر بحث رہا، لیکن ابھی تک اس کی کوئی معقول وجہ تسمیہ سمجھ میں نہ آسکی، بعض لوگ حضرت نوحؑ کے شجرۂ نسب سے متعلق ایک شخص اندلس بن طوبال بن یافث کی طرف اسے منسوب کرتے ہیں۔ بطرس بستانی اور دوسرے اہل نظر کا خیال ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں اسپین کو جرمنی کی ایک قوم فندلس (Vandales) نے فتح کیا تھا، اس کے بعد سے یہ خطہ کبھی واندال، کبھی واندلیشیہ اور کبھی اندلس

کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ عربوں نے سب سے پہلے جنوبی اسپین میں اپنے قدم جمائے، جہاں اس قوم کا اثر زیادہ رہ چکا تھا اس لیے وہ اپنے مخصوص عربی لہجہ میں اسکو اندلیسہ اور پھر اندلس کہنے لگے، اور فتوحات میں وسعت کے بعد بھی مسلمانوں کے تمام مفتوحہ اسپینی علاقوں کو اسی نام سے پکارا جانے لگا۔[1]

علمی ادبی سرگرمیاں اندلس کے مسلمانوں نے علمی ادبی، سیاسی اور معاشرتی میدانوں اور فلسفہ وحکمت اور فنون لطیفہ میں اتنے اہم کارنامے انجام دیئے کہ یورپ کی نگاہیں عرصۂ دراز تک خیرہ رہیں، یورپ کا بیشتر علمی ادبی سرمایہ اسپین ہی کا رہین منت ہے، آٹھوین صدی عیسوی کے وسط سے تیرھوین صدی عیسوی کے آغاز تک عربوں نے علوم وفنون کی شمعین اس طرح روشن کیں کہ ادبیات عالم اور تاریخ تمدن میں اندلس (مسلم اسپین) کو بھلایا نہیں جاسکتا، ہر علم وفن اور شعبۂ حیات میں عرب اور عربی زبان کا تسلط مکمل طور پر اس اہم وسیع وعریض اور بہار آفرین خطہ پر صدیوں تک رہا، تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ جس عظیم سرمایہ سے نیا یورپ تیار ہوا، اس کا نقطۂ آغاز مسلم اسپین ہی تھا۔

اندلس محل وقوع کے اعتبار سے یورپ میں اور اقتدار کے لحاظ سے اہل مشرق کے زیر اثر رہا، جغرافیائی اور طبعی خصوصیات کی دلکشی ورعنائی نے اس پر سونے پر سہاگہ کا کام کیا، اور جلد ہی وہ مشرق ومغرب کی تہذیب وثقافت کا سنگم بن گیا، فلسفہ کو اولیت دی گئی۔ نومسلمون اور غیر مسلموں کی اہمیت افزائی کی گئی، زریاب بحیثیت موسیقی کار مشرق ومغرب میں مشہور ہوا، ابن طفیل، ابن باجہ اور ابن حزم جیسے فلاسفہ نے

---

[1] بطرس بستانی ادباء العرب فی الاندلس ص ۲،

تمام دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا، حکم ثانی کا کتب خانہ شعر وادب، فلسفہ وحکمت اور دوسرے علوم وفنون کے عدیم المثال خزانہ کی حیثیت سے تمام عالم میں مشہور تھا، حکم کی قدر افزائی کا عالم یہ تھا کہ اس نے الاغانی کے ایک نسخہ کے حصول کے لیے ابو الفرج کو ایک ہزار دینار بھجوائے تھے، قرطبہ کی عظیم الشان یونیورسٹی مشرق ومغرب کا مرکز اور علوم وفنون کا سرچشمہ تھی، فرانس اور اٹلی کے طلبہ بڑی تعداد میں یہاں حصول تعلیم کے لیے آتے تھے، بقول علی احمد رفعت یورپ میں نشاۃ ثانیہ اور اصلاح مذہب (Renaissance and Reformation) کی جو تحریکیں قرون وسطیٰ میں ظہور پذیر ہوئیں، ان کے پیشرو وہی افراد تھے جنھوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اندلس کی یونیورسٹیوں سے استفادہ کیا تھا، (تاریخ ادب عربی)

نحو، ادب اور روایت نگاری میں ابو علی قالی عراقی (م ۹۶۷ء) اور ان کے شاگرد محمد بن الحسن زبیدی نے بڑے شاندار کارنامے انجام دیے، الحکم اور ہشام کے زمانہ میں ان کی خدمات علم وادب بہت ممتاز رہیں، ابن عبد ربہ جو عبد الرحمٰن ثالث کا ملک الشعراء تھا، ہشام اول کے غلاموں کی اولاد سے تھا، ابن حزم (م ۱۰۶۳ء) ایک بڑے مفکر فلسفی اور دینی علوم کے مجتہد تھے، یہ عبد الرحمٰن المستظہر اور ہشام المعتز کے وزیر بھی رہے تھے، ابن خلکان نے تاریخ، مذہبیات، حدیث، منطق اور شاعری وغیرہ مین اُن کی چار سو کتابون کا تذکرہ کیا ہے،

شعر وشاعری جہاں کہیں عربی زبان کے قدم پہنچے اس کے جلو میں شعر وشاعری اور اسکی پرجوش خصائص بھی پہنچے خیالات اور مضامین سے قطع نظر اس کی لسانی خوبیوں، موزونیت، فصاحت وبلاغت اور تاثیر وتاثر نے سب کو متاثر کیا، عربی شاعری

کی تمام اعلیٰ خصوصیات کا مظاہرہ اندلس میں بھی ہوا، اور اندلسی شعراء نے محض روایتی شاعری پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جدید اندلسی شاعری کی بنیاد ڈال کر دو جدید اصناف زجل اور موشحہ کو فروغ دیا، اور مناظر فطرت حب الوطنی اور جمال قدرت سے خصوصی لگاؤ ظاہر کر کے نیچرل شاعری کو اوج کمال پر پہنچایا، عروض البلد کے نام سے شہروں اور ملکوں کی کیفیات و مشاہدات نظم کئے انکاری الملعبہ اور المزدوج کے نام سے اصناف و بحور کو رواج دیا۔ عربی شعر و سخن کی دنیا میں ابن زیدون کو غالباً سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے، ابن عبدربہ ابن حزم، ابن الخطیب، ابن ہانی، ابن زمرک وغیرہ کے نام بھی بحیثیت شاعر کے بہت ممتاز و نمایاں ہیں۔

لوئی ویاردو (Louis Viardot) نے اپنی کتاب (History-of The Arabs And Barbers in Spain) میں لکھا ہے کہ "فرانسیسی شاعری بھی ہسپانوی شاعری کی طرح عرب شعراء کی رہین منت ہے۔ اہل فرانس نے یونان و روما سے کوئی اثر نہیں قبول کیا، اور چودھویں صدی عیسوی تک جب کہ ان کے ادب عالیہ کی بنیادیں پڑ چکی تھیں، عربی نمونے ہی ان کے پیش نظر رہے، شعر کے صنائع اور قوافی محض عربوں کی بدولت انھیں حاصل ہوئے، یہ تمام چیزیں ان ہسپانوی تاجروں کی بدولت فرانس اور یورپ کے دوسرے علاقوں میں پہنچیں جو طلیطلہ اور مرسیلیا وغیرہ کے راستے وہاں آیا جایا کرتے تھے"[1]

رائج اصناف شعر میں اندلسی شعراء نے بہت سے اضافے کئے۔ اجتماعی سیاست تاریخی حوادث اور وصف نگاری کی اعلیٰ مثالیں پیش کیں انھوں نے پلوں، محلوں، قلعوں، بتوں، مجسموں،

---

[1] ابو الفضل تاریخ ادبیات عربی،

عمارتوں، حوضوں، چشموں، باجوں، سازوں، باغوں، وادیوں، پہاڑوں، دریاؤں پھلوں پھولوں، کے علاوہ، رقص و سرود کی محفلوں اور فنون لطیفہ کی مختلف صنفوں کے بارے میں بھی نظمیں کہیں، اور یہ تمام نظمیں رقت، گداز اور دلکشی سے معمور ہیں، اور ان کے سانچے اور اسالیب وہی ہیں جو مشرق میں رائج تھے، بعض مقامات پر تنوع قوافی سے بھی کام لیا گیا ہے، بحریں عموماً چھوٹی ہیں۔ موسیقیت اور غنائیت ہر جگہ نمایاں ہے، اندلس کی شاعری نے اہل مغرب کے اس خیال خام کی پوری تردید کر دی کہ عربوں کے پاس داخلی شاعری اور تخیل کی فسوں کاری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اندلسی شعراء نے خارجی شاعری کے ایسے شاندار نمونے پیش کئے ہیں کہ خود اہل مغرب کو ان سے استفادہ کے لئے مجبور ہونا پڑا۔

اندلسی شاعری کے عوامل و محرکات اندلس میں عربی شاعری نے بہت جلد مقبولیت حاصل کی، خصوصاً ازجال اور موشحات نے انسانی جذبات و احساسات کے اظہار اور مناظر فطرت سے لطف اندوزی اور سبق آموزی کا جو نمونہ پیش کیا۔ اس کی مثال دنیا کی ترقی پسند شاعری کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ شعر و سخن کے اس فروغ و ارتقا کے حسب ذیل اہم محرکات تھے۔

(۱) اندلس کے اموی خلفاء شعر و سخن کا بہت اچھا مذاق رکھتے تھے ان میں سے اکثر خود بھی شاعر تھے، پہلا اموی خلیفہ عبد العزیز بن موسیٰ بن نصیر شاعر تھا، اس کے کئی جانشین بھی شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اشبیلیہ کے اکثر فرماں روا شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے۔

(۲) خلفاء کے ساتھ امراء و اعیان مملکت کی ہمت افزائی سے بھی شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ تقریباً ہر حاکم سے متعدد شعراء وابستہ رہتے تھے۔ ہر بڑا شاعر خلیفہ کی سرپرستی اور قدر افزائی سے متمتع ہوتا تھا، وہ سفر و حضر میں خلیفہ کے ساتھ رہتا تھا

اور اگر انفقدر انعامات سے نوازا جاتا تھا۔ مشرق کی علم دوستی اور ادب نوازی کی روایت کو اموی خلفاء نے پوری طرح زندہ رکھا۔

(۳) اندلس کا سرسبز و شاداب، حسین جمیل اور رومان پرور ماحول بھی جو مشرق سے بہت مختلف تھا، شاعرانہ ذوق پیدا کرنے میں اہم محرک ثابت ہوا، اسپین کے باغات، لالہ زار، وسیع و عریض میدان اور چراگاہیں، پہاڑ اور ان میں جنگلوں کی لامتناہی سلسلے، دریا اور ان کے شاداب، ہرے بھرے کنارے پھولوں اور پھلوں کی کثرت منطقہ معتدلہ کے باعث حسن و نزاکت کی فراوانی متعدد اقوام و ملل کا امتزاج، بحری زندگی کے اثرات اور حسین فطری مناظر کی کثرت نے ان کے شاعرانہ جذبات کو ابھارا اور وہ فطری شاعری پر مائل ہو گئے۔

(۴) اس شاعرانہ ماحول میں عربوں کی خداداد شاعرانہ فطرت و وجدان نے عجیب عجیب شاعرانہ روپ اختیار کیے۔ فصاحت و بلاغت انھیں ورثہ میں ملی تھی۔ جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

(۵) تہذیب کی ثقافت کے ساتھ عیش و عشرت کی فراوانی اور اس کے اسباب کی رنگا رنگی بھی ان کے کلام میں جدت، ندرت اور نئے نئے اصناف سخن پیدا کرنے کا سبب بنی اور ان کے کلام میں لوچ، رقت موسیقیت اور گداز بھر گئی۔[۱]

ان اسباب و عوامل کی بنا پر فصحاء نے موشحات کو گلے لگایا، اور عوام زجل کی طرف مائل ہوئے اور رفتہ رفتہ زجل نے بھی ادب کی ایک اعلیٰ صنف کی حیثیت سے اپنا درجہ منوا لیا۔

---

[۱] عبدالمنعم خفاجہ۔ قصۃ الادب فی الاندلس ص ۸۰

اندلسی شاعری کی امتیازی خصوصیات

الفاظ، اسالیب، تخیل اور موضوعات کے لحاظ سے اندلسی شاعری کی نمایاں امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) الفاظ و اسالیب کے لحاظ سے نہایت سلیس و شگفتہ ہے، جو اندلس کے نرم اور معتدل رومان پرور ماحول کا لازمی نتیجہ اور صنائع بدائع کی تکلفات سے بری ہے، ابن ہانی اندلسی کے یہاں کچھ بداوت مشکل پسندی اور تصنع ضرور ہے، مگر وہ عمومی روش سے الگ ہے۔

(۲) دقیق خیالات اور فلسفیانہ مسائل سے مکمل احتراز۔ بعض فلسفی شعراء مثلاً ابن الطفیل اور ابن باجہ کے یہاں جو فلسفیانہ تخیلات ہیں وہ بھی نہایت صفائی و شگفتگی کے ساتھ ہیں۔

(۳) ہرے بھرے جزیرہ نما میں جمال فطرت کی رعنائیوں کی بنا پر انوکھے تخیلات اور آسان تراکیب کے ساتھ خوبصورت تشبیہات اور لطیف کنایات شعر و سخن کے لطف کو دوبالا کرتے ہیں۔

(۴) عرب حکمرانوں کے اسپین میں قدم جمنے کے بعد شاعری کا فروغ درج ذیل اغراض کے تحت ہوا۔

مدح، ہجا، مراثی، فخر، حماسہ، تہنیت، وصف و غزل، ساقی و میخواری، توصیف غلمان و نساء، تصوف اور شعر الطبیعۃ، اس کے باوجود اندلسی شعراء کچھ چیزوں میں مشرق سے فائق و ممتاز ہیں اور کچھ اوصاف میں ان سے کمتر ہے، فلسفہ و حکمت اور زہد و تصوف میں اندلسی شاعری ہمیشہ مشرقی شاعری سے پیچھے رہی۔

(۵) اسلامی مقبوضات سے نکلے ہوئے ملکوں کا مرثیہ مثلاً صالح بن شریف رندی کا مرثیہ رثاء الاندلس،

لکل شیئ اذا ماتم نقصان
فلا یغر بطیب العیش انسان[1]

لمثل هذا یذوب القلب من کمد
ان کان فی القلب اسلام وایمان

(جو چیز کمال کے درجہ کو پہنچ جائے اس کے لئے زوال یقینی ہے اسلئے کسی انسان کو عیش و عشرت کی زندگی سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے جس کے دل میں اسلام اور ایمان ہو، اس کا دل ایسے حوادث (اندلس کا زوال) پر شدت غم میں گھل جاتا ہے۔)

(۶) وصفیہ شاعری خصوصاً نیچرل شاعری (Poetry of Nature) میں اندلسی شاعری پوری عربی شاعری پر فائق ہے، جمال فطرت کی رعنائیوں کا وصف جس خوبی و خوش اسلوبی سے اندلسی شعراء نے کیا ہے وہ ادب لطیف اور ذوق جمال کی تسکین کے لیے گنج گراں مایہ ہے۔

شاہین قریش خلیفہ عبد الرحمن اوّل ایک دن قرطبہ میں اپنے باغ میں بیٹھا ہوا تھا اسکی نظر ایک کھجور کے درخت پر پڑی جو ملک شام سے لاکر یہاں لگا دیا گیا تھا اسے دیکھکر اسکے حب وطن کے فطری جذبات جاگ اٹھے اور جلا وطنی کے تلخ واقعات کو یاد کرکے یوں نغمہ سرا ہوا۔

یا نخل انت فریدة مثلی
فی الارض نائیة عن الاهل

تبکی وهل تبکی مکممة
عجماء لم تجبل علی جبل

ولو انها عقلت اذن لبکت
ماء الفرات ومنبت النخل

لکنها حرمت واخرجنی
بغضی بنی العباس عن اهلی

لنشأت بارض انت فیها غریبة
فمثلک فی الاقصاء والمنتأی مثلی

سقتک الغوادی المزن فی المنتأی الذی
یسح ویستمری السماکین بالوبل

شاعر مشرق ڈاکٹر سر اقبال نے جب سرزمین اندلس میں عبد الرحمن اوّل کے بوئے ہوئے

---

[1] عبد المنعم خفاجہ، قصۃ الادب فی الاندلس، ص، ۱۷۲،

اس درخت کو دیکھا تو انھیں عبد الرحمن اوّل کے مندرجہ بالا اشعار یاد آگئے، جنھیں المقری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے، یہ درخت مدینۃ الزہراء میں تھا، اس کو دیکھتے ہی اقبال کے شاعرانہ جذبات بھڑک اٹھے، اور انھوں نے یہ مشہور نظم لکھی،

میری آنکھوں کا نور ہے تو
میرے دل کا سرور ہے تو

اپنی وادی سے دور ہوں میں
میرے لئے نخل طور ہے تو

مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا
صحرائے عرب کی حور ہے تو

پردیس میں ناصبور ہوں میں
پردیس میں ناصبور ہے تو

غربت کی ہوا میں بارور ہو
ساقی ترا نم سحر ہو

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

ان اشعار کو عبد الرحمن اوّل کی پوری نظم کا لفظ بہ لفظ ترجمہ تو نہیں کہا جاسکتا لیکن اکثر بیشتر اشعار کو یقینی طور پر اسی کا مکمل اردو روپ قرار دیا جاسکتا ہے۔

اندلسی شاعری کی غرض و غایت

اسلوب کے لحاظ سے اندلس کی شاعری کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) روائتی (مشرقی) شاعری، (۲) نئی (اندلسی) شاعری،

نئی اندلسی شاعری کی بنیاد دو نئے اندلسی اسلوب نگارش زجل اور موشحہ پر ہے، بحیثیت مجموعی تمام شاعری پر رومانیت اور نیچر کے اثرات و عناصر چھائے ہوئے ہیں، ان ہی اثرات و عناصر کی تنظیم و ترتیب نیچرل شاعری "شعر الطبیعۃ" کے نام سے یاد کی جاتی ہے،

عموماً اندلسی شاعری درج ذیل اغراض کے ماتحت وجود میں آئی تھی:۔

مدح | قدیم اسلوب کے مطابق اندلسی شعرا مدح سے گریز تو نہ کرتے تھے، لیکن انکی مدح میں شخصی تعلق، طوالت اور ثقالت و غرابت نہیں ہے، متنبی کا انداز صرف ابن ہانی کے یہاں پایا جاتا ہے، جسے عمومیت حاصل نہ تھی، عام طور پر اندلسی شعرا کے مدائح مناظر فطرت، شراب، شہر اور معشوقوں سے متعلق ہوتے تھے، قدیم مدحیہ قصائد کے اجڑے دیار، ٹیلے، چٹیل میدان اونٹ اور گھوڑے یہاں تقریباً ناپید ہیں۔

مرثیہ | اہل مشرق کی طرح مشرقی اسلوب ہی میں یہ لوگ بھی مرثیہ گوئی کرتے تھے انہیں درد و اثر تو ضرور ہوتا تھا، مناقب اور مصائب کے تذکرے بھی ہوتے تھے، لیکن اندلس میں امثال و حکم کی گہرائی اس درجہ کی نہ تھی، زیادہ تر گردش ایام کے شکوے ہوتے تھے،

البتہ اجڑے دیار سے متعلق مرثیے اندلسی شاعری میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، یہ مرثیے درد و اثر و تاثیر و تاثر، اور خوبی و دلکشی میں مشرق کے مراثی سے آگے ہیں، ابو البقاء صالح بن شریف رندی اندلس کے مرثیہ میں کہتا ہے، ؎

وھذہ الدار لا تبقی علی احد ولا یدوم علی حال لھا شان

اتی علی الکل امر لا مرد لہ حتی قضوا فکأن القوم ما کانوا

(یہ دنیا کسی کے لئے ایک حال پر نہیں رہتی، اس کی حالت بدلتی رہتی ہے، ہر شخص پر ایسا وقت آتا ہے جو ٹالا نہیں جا سکتا اور قدرت کا فیصلہ ناطق ہو جاتا ہے اور قوم جیسی تھی ویسے ہو جاتی ہے) شکوہ و گلہ اور لطف و کرم کی درخواست مناصب گم گشتہ اور متاع گم کردہ کی حسرت پر بہت سے شعرا نے اشعار لکھے، انھیں بھی اسی ضمن میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً معتمد ابن عباد کے وہ اشعار جو اس نے غریب الوطنی و جلا وطنی کی زندگی میں ازنفہ کے اغمات کے مقام پر قید کی حالت میں لکھے ہیں۔

ہجو | ہجوگوئی کا بازار اندلس میں گرم نہیں ہوا، اور جریر، فرزدق، اور اخطل کی سیاسی ہجووں کو یہاں تلاش کرنا بے سود ہے، سیاسی جماعتیں بھی یہاں کچھ زیادہ نہ تھیں، اکثر لوگ اپنے اپنے کاموں یا آسائشوں میں مست تھے، تاہم جہاں کہیں اس کا کوئی نمونہ ملتا ہے اس کا انداز پرانا مشرقی ہے اس میں کوئی قابل لحاظ جدت و ندرت نہیں ہے امرا کے عہد میں مغربیوں اور یمنیوں کے درمیان کچھ چشمک اور ہجوگوئی ہوئی، لیکن ان ہجویات کی حفاظت کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا، اسی طرح شعوبیہ اور فرنگ کی ہجوگوئی کے آثار بھی کہیں کہیں ملتے ہیں، ابو بکر المخزومی نام کا ایک اندھا شاعر اندلس کا سب سے بڑا ہجوگو شاعر بتایا جاتا ہے، اس نے نزہون بنت القلاعی نامی ایک شاعرہ کی فحش انداز میں ہجو کی نزہون نے بھی اس کا بھرپور جواب دیا تھا جسے بخوف طوالت قلم انداز کیا جا رہا ہے،

حکمت و فلسفہ کی باتیں | فلسفہ کا ظہور و ارتقا، اندلس میں پانچویں صدی کے اواخر میں مرابطین اور موحدین کے دور میں ہوا، جو فلسفیانہ افکار اور علوم و فنون کے فروغ کا زمانہ تھا، اسی میں ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، ابن میمون، ابن خاقان، ابن بشکوال، ادریسی، ابن جبیر اور ابن بسام وغیرہ نمایاں ہوئے، اس سے پہلے اگر ابن حزم کا وجود نہ ہوا ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ یہ زمانہ فلسفہ کے بحران کا زمانہ تھا، اندلس میں فلسفہ کے ارتقا کی تاخیر کا سبب وہ تنگ خیال شیوخ تھے، جو حریت فکر کو ناجائز، اور تفلسف کو کفر کہتے تھے، تاہم حکمت و فلسفہ کے میدان میں ابن ہانی کا مقام سب سے بلند سمجھا جاتا ہے، اس نے متنبی کی پوری تقلید کرنا چاہی۔ لیکن اس سے بہت پیچھے رہا، اس کے یہاں زمانہ کا شکوہ اور دنیا سے بیزاری بکثرت ہے،

تصوف و زہد | زاہدانہ خیالات کی ترجمانی بھی اندلسی شاعری میں کم نہیں ہے کچھ جبہ و دستار

دستار والے شیوخ خلفاء کے دربارمیں تقرب حاصل کرنے کے لیے زاہدانہ خیالات ظاہر کرتے تھے۔ البتہ ملوک الطوائف کے عہد میں لوگ تمرد و فتن سے تنگ آکر اس دنیا کو سرائے فانی گردانے لگے تھے، ابن عبدربہ کہتا ہے:۔

هي الدار ما الآمال الا فجائع — عليها ولا اللذات الا مصائب
فلا تكتحل عيناك منها بعبرة — على ذاهب منها فانك ذاهب

بہت سے شعرا نے محض تفنن طبع کے طور پر زاہدانہ خیالات کی ترجمانی کی ہے،

ابن عربی (شیخ المتصوفین) کی صوفیانہ شاعری حقیقۃً جاندار شاعری ہے، ان کے صوفیانہ خیالات کی دھوم مغرب سے لیکر مشرق تک تھی، لوگ ان کے کلام کو شوق ذوق سے پڑھتے تھے۔ اندلس کے سب سے بڑے صوفی شاعر یہی ہیں،

حماسی شاعری: اندلس کے شعرا نے بذات خود کبھی معرکہ آرائیوں میں حصہ نہیں لیا، جس طرح قدیم شعرا حصہ لیتے تھے، یہاں کے شعرا قلم سنبھالنے کے بعد تلوار کے دھنی نہ رہتے تھے اسلئے ان کی شاعری میں حمایات (جواں مردی کے عناصر) بہت ہی کم ہیں اور وہ معرکہ آرائیوں میں اپنے تجربات و مشاہدات بیان کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور صرف امراء و خلفاء کے جنگی کارناموں کی خیالی تصویر پیش کرتے ہیں،

ملوک الطوائف کے دور کے شعراء تو محض گریہ و بکا اور یاس و ناامیدی کے شعرا معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ان کو عیش و عشرت کی زندگی نے انتہائی نرم دل، نازک طبع اور جمال پرست بنا دیا تھا، منافرت کے جذبات بھی بہت کم ہیں، البتہ دینی مفاخرت کہیں کہیں ملتی ہے، البتہ ابن دہبون کے کلام میں جو معتمد بن عباد کا درباری شاعر تھا مفاخرت اور شجاعت و بہادری کے کچھ عناصر ملتے ہیں۔ مگر ان میں تکلف اور آورد زیادہ ہے۔

غزل اور بادہ کشی: یوں تو فطرت اور مظاہر فطرت اور جمال کائنات کی وصف نگاری اندلسی شاعری کی جان ہے، اسی کو پہلا درجہ دیا جاتا ہے، لیکن رندی و سرمستی اور غزل سرائی پر مبنی اشعار کی حیثیت بھی اندلس میں کبھی کم نہیں رہی، درحقیقت ذوق جمال کی آسودگی کی تلاش ہی کا دوسرا نام غزل سرائی و سرمستی کہا جاسکتا ہے۔ کنیزوں اور غلمان کی خرید و فروخت اور ہر ہر شہر میں اس مقصد کے لئے نخاسہ بازار کا وجود اس قسم کے فراری ادب کے پیدا کرنے کا ذریعہ رہے، اور لوگ زندگی کی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرکے حکایت با یار گفتن کے تصورات کے ساتھ یک گونہ بے خودی میں غرق رہے، اندلسی شاعری میں اس قسم کی شاعری کی کمی نہیں، ان کی اکثر غزلیں تقلیدی اور تکلف و تصنع سے بھی بھری ہوئی ہیں، انھوں نے اتنا تو ضرور کیا کہ اسلوب قدیم کی کچھ چیزیں ترک کردیں، مثلاً تغزل و تشبیب کے اشعار میں بادیہ کا ذکر راستہ کی مشقت و صعوبت اثنائے راہ میں قیام، محبوب کی یاد کا ذکر اور پھر روانگی اور اسی طرح کی دوسری تقلیدی باتیں چھوڑ دیں، لیکن اس کے بعد بھی ترقی پسندانہ تشبیب کا رجحان پیدا نہ ہوا، بلکہ اس کی جگہ فحش گوئی اور اخلاق سے گری ہوئی باتوں نے لے لی، اور ملوک الطوائف کے عہد تک پہنچتے پہنچتے غزل گوئی عریاں نگاری اور فحش گوئی کا دوسرا نام ہوگئی۔

خارجی شاعری: خارجی شاعری (وصف نگاری) تمام اندلسی شاعری پر حاوی ہے، شعرائے اندلس کا اصل کمال فطرت کی عکاسی اور جمال کائنات کی تصویر کشی ہے، لہو و لعب، رقص و سرود، سیر و شکار، محلات وغیرہ مظاہر تمدن کی مصوری ان کا محبوب موضوع تھا، اور رزم، بزم دونوں کی مرقع نگاری اوج کمال پر پہنچ گئی تھی،

اندلسی شاعری نے مختلف اغراض واصناف کے لئے جو اسلوب بیان اختیار کیا وہ قدامت کے باوجود اپنی مخصوص سادگی، موسیقیت اور نغمہ ریزی میں اپنی مثال آپ ہے، ... شعرائے اندلس کا حقیقی کارنامہ موشحات واز جال میں نیچرل شاعری کی دلکش تعبیر ہے، روایتی شاعری پر ان کی عظمت فن کی بنیاد نہیں ہے۔[1] ابن خفاجہ پھول کی توصیف میں کہتا ہے کہ پھول تکبر سے اترا رہے ہیں، اور ان کو حیا نے سرخ زیور اور سبز چادروں میں ملبوس ومزین کر رکھا ہے۔

ومسائسة تزهى وقد خلع الحيا — عليها حلى حمرا وارديه خضرا

شعر الطبیعة (رومانی شاعری)

شعر الطبیعہ (Poetry of Nature)

اندلسی شاعری کی جان ہے شعرائے اندلس نے موشحات کے حسین پیکر میں نیچرل شاعری کی روح پھونک کر یورپ کو فطرت پسندانہ روایات (Roonanticis m) سے آشنا کر کے سکوت لالۂ وگل سے کلام پیدا کرنے اور پھر اس کے وسیلہ سے ازلی وابدی حقیقت (Ultimate Reality) تک پہنچنے کا فن سکھایا، یہ شاعری اندلس کی تمام اصناف سخن پر حاوی ہے۔

مناظر فطرت اور جمال کون ومکان سے محظوظ ہونا انسان کی فطرت ہے، ہرے بھرے باغ، صاف شفاف جھیلوں اور دریاؤں، گنگناتی ہوئی ندیوں اور دوسرے لاتعداد جمال فطرت کے مظاہر سے کون سرور وانبساط محسوس نہیں کرتا؟ اندلس اس قسم کے حسین مناظر سے مالامال تھا، اس لئے اندلسی شعراء قدرۃً اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، جس کا اندازہ ان کی شاعری سے بخوبی ہوتا ہے، جو اس قسم کے دلکش مظاہر کی جیتی جاگتی

[1] جودت الرکابی "فی الادب الاندلسی" ص ۶۱

تصویر ہے۔

یوں تو عصر جاہلیہ میں بھی اس قسم کی شاعری کی کمی نہیں تھی لیکن اس میں یہ عناصر تشبیہات واستعارات کے پردوں میں غیر منظم انداز میں بکھرے ہوئے تھے، باقاعدہ طور پر جمال فطرت کی توصیف پر توجہ اس دور میں نہیں کی جا سکی اموی دور میں جب بدویت کا اثر کم ہو گیا اس وقت غزل، مدح خمریات اور مظاہر فطرت کے عناصر زیادہ نکھر کر سامنے آئے۔

عباسی دور علوم وفنون کی ترویج واشاعت کا دور تھا۔ تاہم ابو تمام، بحتری، ابن الرومی اور ابن المعتز نے فطرت پسندانہ ادبی روایات کی شمعیں روشن رکھیں لیکن اس کی جانب باقاعدہ توجہ نہ تھی، چوتھی صدی ہجری میں صنوبری نے کی جو اسکا امتیازی وصف ہے۔ لیکن اسی کی ذات تک اس کا دائرہ محدود رہا۔

اندلس کی نیچرل شاعری کو تین مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) نیچرل شاعری کا پہلا مرحلہ اموی خلافت کی ابتدا سے گیارہویں صدی عیسوی تک رہا، اس دور میں ابن ہانی، ابن عبد ربہ، ابن دراج اور قسطلی جیسے شعراء مشرق کے انداز پر تقلیدی شاعری میں منہمک رہے اس لئے نیچرل شاعری ابتدائی مرحلہ کے آگے نہ بڑھ سکی۔

(۲) دوسرا مرحلہ گیارہویں صدی عیسوی کی ابتدا سے اس کی انتہا تک حاوی رہا، اس پوری صدی میں تقلید مشرق سے مکمل آزادی تو حاصل نہ ہوئی، لیکن اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ موشحات بھی لکھے جانے لگے تھے۔ جدت وندرت اور ذوق جمال کی آسودگی سے متعلق ادبیات کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا۔ اس دور کے نمائندے ابن زیدون، معتمد اور ابن حمدیس تھے۔

(۳) تیسرا مرحلہ بارہویں صدی پر محیط ہے، یہ مسلم اسپین کی آخری صدی تھی،

اس صدی میں نیچرل شاعری کے لعل و جواہر عام ہوئے، یہ دور ابن خفاجہ، ابن سہل اور ابن الخطیب کی شاعرانہ جدتوں سے شعر الطبیعۃ کا دور عروج بن گیا، رہا موشحات اور ازجال کا فروغ باقاعدہ طور پر اسی دور میں ہوا۔

اندلس کی نیچرل شاعری کی نمایاں خصوصیات

اندلسی شاعری میں فطرت پسندانہ عناصر سے تاثیر و تاثر کی خصوصیت عام رہی اس کے نمایاں پہلو حسب ذیل ہیں۔

(۱) اندلسی شعراء اگرچہ عرب تھے لیکن ان کا قلبی تعلق اندلس سے تھا جس کی جھلک انکے پورے کلام میں نمایاں ہے۔ اس کو وہ جنت ارضی تصور کرتے تھے۔

وہ اہل اندلس کو مخاطب کرکے وہاں کے دریاؤں، چشموں اور سایہ دار درختوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ے

اگر فردوس بر روئے زمین است　　ہمین است وہمین است وہمین است

ابن خفاجہ اسی مفہوم کو یوں ادا کرتا ہے۔ ے

یا أهل اندلس لله درکم　　ماء وظل وانهار واشجار

ما جنة الخلد الا فی دیارکم　　ولو تخیرت هذا کنت اختار

اے اہل اندلس اللہ نے تمکو آب رواں، سایہ، نہریں اور درخت عطا کئے جنت خلد تمہارے ہی ملک کا نام ہے اگر مجھے ان دونوں میں سے انتخاب کا اختیار دیا جائے تو اندلس ہی کی جنت کو اختیار کروں۔

(۲) اس کی نیچرل شاعری کی دوسری خصوصیت اندلس کی خارجی توصیف اور مادی ظواہر کی تحسین ہے۔ وہاں کے شعراء جس طرح مظاہر فطرت کی مصوری کرتے تھے اسی طرح عمارتوں کے حسن کی بھی توصیف کرتے تھے، اور چاند سورج، دریاؤں اور آبشاروں کے

ساتھ ساتھ محلوں، مسجدوں، حوضوں اور دوسری عمارتوں کی توصیف کے نمونے بھی موجود ہیں۔ فواروں کی توصیف ایک شاعر اس طرح کرتا ہے۔

قضب من البلور اثمر فرعها　　لما انتهت باللؤلؤ المتحدر

(فوارے گویا بلور (شیشہ) کی مکمل شاخیں ہیں جنکی ٹہنیوں میں ڈھلکتے ہوئے موتی ثمر بار ہوں)

(۳) اپنے شہروں کی ثنا و صفت بیان کرتے تھے، ابن زیدون نے قرطبہ کی تعریف کی ہے۔ ابن زہر اشبیلیہ کی یاد میں رطب اللسان ہے تو ابن نزار وادی اشات کو جنت نشان بتاتا ہے۔

وادی الاشات یهیج وجدی کلما　　اذکرت ما قضیت بک النعماء

اے وادی اشات جب میں تیری نعمتوں اور اس پر لطف زندگی کو یاد کرتا ہوں جو تیرے یہاں بسر کی ہے تو میرا وجدان بھڑک اٹھتا ہے۔

سیر و سیاحت میں جو جو مقامات جاذب نظر ہوئے سب کا دلکش وصف مرقوم ہے۔

(۴) وہ نیچر کو جاندار فرض کرکے خوشی و غمی کے جذبات اس کی جانب منسوب کرکے تصور کرتے تھے کہ نیچر ان کے سکھ دکھ میں برابر شریک و سہیم ہے۔ جیسا کہ ابن نزار کہتا ہے۔

والنهر یبسم بالحباب کانه　　سلخ نضته حیة رقطاء

تاج محل کی تعمیر اور استاد احمد لاہوری

(تحقیق مزید کی روشنی میں)

مترجمہ - محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے

ایک زمانہ تک تاج محل اور لال قلعہ کے معمار یورپین خیال کئے جاتے تھے، استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اب سے تقریباً نصف صدی قبل ۱۹۳۳ء میں دیوان مہندس کی دریافت کے بعد اسی کی روشنی میں غالباً پہلی بار یہ انکشاف کر کے حقیقت کی پردہ کشائی کی تھی کہ مذکورہ بالا دونوں عمارتوں کی نقشہ سازی اور تعمیر در اصل استاذ احمد لاہوری کے جودت تخیل اور چابکدستی کا نتیجہ ہے، موصوف نے اپنا یہ تحقیقی مقالہ "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" کے عنوان سے ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے پہلے اجلاس میں پڑھا تھا، اس کے بعد معارف ۳۶ء کے کئی نمبروں میں بالاقساط شائع ہوا اور اب مقالات سلیمان جلد اول، تاریخی میں بھی آگیا ہے۔

ذیل کا مقالہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، فاضل مقالہ نگار ایچ، آئی، ایس کنور صاحب (دہلی) گذشتہ پندرہ سال سے تاج محل اور اس کی تعمیر کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ اور اس موضوع پر ایک تحقیقی کتاب

تیار کر رہے ہیں۔ زیر نظر مقالہ میں انھوں نے سید صاحب کی قیمتی تحقیقات سے استفادہ کرنے کے ساتھ بہت سے نو دریافت و نایاب قلمی ماخذوں سے بھی پورا فائدہ اٹھایا ہے جن تک سید صاحب کی رسائی نہیں ہو سکی تھی، اس طرح یہ مقالہ نہ صرف سید صاحب کے مضمون کے تتمہ و تکملہ کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ اس میں بعض نئی تحقیقات اور جدید انکشافات پہلی بار منظر عام پر لائے گئے ہیں، اسی افادیت کے پیش نظر اس کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے، یہ مقالہ مشہور انگریزی رسالے اسلامک کلچر کے اپریل ۷۳ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ (نعیم ندوی)

تاج محل کی تکمیل ۱۶۵۳ء میں ہوئی۔ اس وقت سے فن تعمیر کا یہ لافانی نمونہ برابر دلچسپیوں کا مرکز رہا ہے، تین صدی سے زیادہ کے عرصہ میں جس سیاح اور اہل علم نے بھی اسے دیکھا ہے اس کے بے نظیر فن تعمیر اور نقاشی پر حیرت زدہ ہو کر رہ گیا ہے، ان میں سے کچھ لوگ تو اس کے حسن سے اسقدر مرعوب ہوئے کہ ان کا قلم ان کے صحیح جذبات کی ترجمانی سے قاصر رہا، اس کے حسن سے لطف اندوز ہونے والوں میں کچھ تاریخ فنون لطیفہ اور فن تعمیر کے ماہرین ایسے بھی رہے ہیں جو تاج کی دلکشی سے مسحور ہو کر اس سے وابستہ بعض رموز کو حل کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں، ان ہی رموز میں سے ایک معمہ ان اشخاص کی تحقیق کا بھی ہے جنھوں نے تاج محل کا نقشہ تیار کیا تھا۔

ابھی کچھ عرصہ قبل تک اس کا سہرا مندرجۂ ذیل لوگوں کے سروں پر باندھا جاتا رہا ہے، اٹلی کا ایک جوہری جیرانیمو ویرونیو (Geronimo Veronco) ایک فرانسیسی صراف آسٹن دی بورڈو[۱] (Austui de Bordeaux)

(حاشیہ نمبر ۱ ص ۱۳۲)

ایک ایرانی پناہ گزین علی مردان خان جو عہد شاہجہانی کا ایک مشہور انجینیر تھا۔ چوتھا، شخص استاد عیسیٰ آفندی ہے جو روم کا ایک ترکی باشندہ اور آگرہ میں مقیم تھا[1]۔ مذکورۂ بالا تمام افراد کے معمار تاج ہونے کی موافقت میں بہت سے دلائل فراہم کئے گئے ہیں لیکن ابھی یہ تحقیق کسی اطمینان بخش مرحلہ تک نہیں پہنچ سکی ہے، اور اس کا کوئی حتمی ثبوت نہیں مل سکا ہے کہ ان ہی اشخاص میں سے کوئی تاج محل کا معمار تھا،

یہ اختلاف رائے ۱۸۴۴ء سے شروع ہوا جب سر ولیم سلیمن (Sir William Sleeman) نے یہ تحقیق پیش کی کہ تاج محل کا نقشہ آسٹن دی بوردو نے تیار کیا تھا، ۱۹۰۳ء سے اسوقت یہ جوش اور بڑھا جب ای۔ بی۔ ہیول (E.B. Havell) نے عیسیٰ آفندی کی موافقت میں دلائل پیش کئے۔ اس کے بعد پادری ایچ ہاسٹن (H-Hosten) نے ۱۹۱۰ء میں یہ رائے ظاہر کی کہ اصل معمار اٹلی کا جیرانیمو ویرونیو تھا، جیمس فرگوسن (Tames Fergusson) نے یہ تحقیق پیش کی کہ در اصل تاج محل کا نقشہ نویس علی مردان خاں تھا،

مگر مذکورۂ بالا تمام محققین میں سے کسی نے بھی اپنے دعوی کے ثبوت میں کوئی ایسی واضح دلیل نہیں دی، جس سے غیر مشتبہ طور پر تاج محل کے نقشہ ساز کی تعیین ممکن ہو سکے۔ ظاہر ہے اس طرح کا مستند ثبوت عہد شاہجہانی یا اس کے قریبی عہد کی کسی

(حاشیہ نمبر ا ص ۲۱) [1] یہ بات اب مسلم ہو چکی ہے کہ آسٹن بوردو کا تاج محل کے نقشہ سازی یا نقاشی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ملاحظہ ہو راقم سطور کا مقالہ "آسٹن بوردو" رسالہ انڈیکا بمبئی مارچ ۱۹۵۳ء۔ [2] ملاحظہ ہو میرا مقالہ "نام نہاد استاد عیسیٰ اور تاج محل" رسالہ انڈیکا بمبئی مارچ ۱۹۵۵ء جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ استاد عیسیٰ کا نام اٹھارہویں صدی کی محض ایک فرضی ایجاد تھی،

دستاویز ہی سے فراہم ہو سکتا ہے،

۱۹۳۰ء کے اوائل میں بنگلور کے ایک محقق سید محمود خاں ایک دن اپنی لائبریری کی قدیم کتابوں اور قلمی نسخوں کو الٹ پلٹ رہے تھے کہ اتفاقاً ان کا ہاتھ ایک فارسی مخطوطہ پر پڑ گیا، جس کا نام دیوان مہندس مصنفہ لطف اللہ مہندس تھا۔ اس میں تاج محل اور لال قلعہ کا تذکرہ تھا۔ اس مخطوطہ کے مصنف کے بیان سے محمود خاں کو پتہ چلا کہ تاج محل اور لال قلعہ دہلی دونوں کا نقشہ شاہجہان کے حکم سے استاد احمد لاہوری نے تیار کیا تھا، وہ شاہی معمار تھے، اور انھیں نادر العصر کہا جاتا تھا[1]۔

اس سے محمود خان کو اس مخطوطہ کی اہمیت کا احساس ہوا اور انھوں نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح دیوان مہندس کا یہ مخطوطہ ان کے ہاتھ لگا۔ وہ لکھتے ہیں۔

" یہ کتاب منظوم اور فارسی رسم الخط میں ہے، اس کے مصنف لطف اللہ مہندس ہیں۔ یہ تقریباً تین سو سال قدیم ہے، اور شاہجہانی دور کے آخری ایام تک کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ مہندس کی ذاتی تحریر ہے۔ اس کتاب کی مختلف نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مصنف شاہجہاں کے بڑے لڑکے دارا شکوہ کا مستعد حامی تھا۔ جب دارا شکوہ کو شکست دیکر اورنگ زیب نے عنان حکومت سنبھالی تو مصنف اور اس کے اہل خاندان کو سخت نقصانات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس نے شاہجہان کی خدمت میں ایک عرضداشت بھجوائی (ص ۹۹) لیکن اس کی شنوائی نہیں ہوئی۔ اور بالآخر اس خاندان کو گوشۂ عزلت اور غربت میں

[1] "تاج محل کے معمار ـــــ ایک قدیم راز کا انکشاف" از محمود خان السٹریٹڈ ویکلی بمبئی، ۱۸ اپریل ۱۹۳۳ء ص ۳۰

پناہ لینی پڑی۔ (ص ۶۸)"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے خوف سے مصنف کے خاندان والوں نے اس کتاب کو چھپائے رکھا۔ کیونکہ اس میں دارا شکوہ کی شان میں نظمیں تھیں، بعد کی تاریخوں اور آخری صفحہ کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کو مشہور تاریخی شخصیت نواب ابراہیم خان ہزبر جنگ نے خرید کر اپنی لائبریری میں داخل کر لیا تھا، نواب موصوف ایک مشہور مسلمان فوجی افسر تھے جن کا عرف گارڈی تھا، انھوں نے ۱۷۶۱ء کی جنگِ پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کے خلاف مرہٹوں کا ساتھ دیا تھا۔"

"یہ کتاب میرے خاندان میں کئی نسلوں سے چلی آرہی ہے، لیکن اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اسوقت ہوا جب یہ مشہور مورخ، مصنف اور محقق علامہ سید سلیمان ندوی کے ہاتھ لگی۔ اسی کتاب سے مواد فراہم کر کے علامۂ موصوف نے ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور میں تاج محل کے معماروں کے بارے میں ایک طویل و بسیط مقالہ پڑھا۔"

اب سید محمد خاں کو لطف اللہ مہندس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور انھوں نے ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کو ایک بسوط خط لکھا، اس کے جواب میں علامہ موصوف نے سید محمد خاں سے وہ مخطوطہ مطالعہ کے لیے مانگا، جب یہ کتاب سید صاحب مرحوم کو ملی تو اس کے مطالعہ سے ان کی آنکھیں فرطِ استعجاب سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، کیونکہ ۹۶ صفحات پر مشتمل اس منظوم مخطوطہ میں تاج محل اور لال قلعہ کے نقشہ نویسوں اور معماروں کے بارے میں کافی معلومات اور

واضح تفصیلات درج تھیں، اس کے مصنف لطف اللہ مہندس کا بیان ہے کہ ان کے باپ کا نام استاد احمد لاہوری تھا، جنھیں نادر العصر کا خطاب ملا تھا، مخطوطہ میں انکے بارے میں یہ تفصیلات درج تھیں۔

"احمد معمار جو اپنے فن میں دوسرے فنکاروں سے سیکڑوں منزل آگے تھے، وہ فن تعمیر سے متعلق کتابوں اور مقالات پر بھی پوری دسترس اور واقفیت رکھتے تھے، اور فن تعمیر کے مختلف نمونوں اور تفصیلات سے بھی پوری طرح آگاہ تھے، انھیں علم نجوم و ہئیت میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، عالم پناہ سے ان کو نادر العصر کا خطاب عطا ہوا تھا، وہ شاہی معمار تھے، ان کو تقرب شاہی حاصل تھا جب شاہی علم آگرہ پر لہرا رہا تھا، اُس وقت ان پر شہنشاہ کی خاص نظر کرم تھی، اس فاتح عالم بادشاہ کے حکم پر انھوں نے ممتاز محل کا مقبرہ تعمیر کیا۔"

"اسی شہنشاہ کے ایما پر احمد نے لال قلعہ دلی بھی تعمیر کیا، جو اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ یہ دونوں عمارتیں جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے، اور جن کے محاسن اجاگر کرنے میں میرے قلم نے بڑی جولانی و روانی دکھائی ہے، استاد احمد کی مہارت فن کا محض ایک نمونہ ہیں، یا یوں سمجھ لیجئے کہ موتیوں کی لڑی میں سے محض ایک موتی ہے۔"[۵]

ان تفصیلات کے علم اور انکشاف سے ظاہر ہے سید صاحب کو حد درجہ فرحت و مسرت

---

[۵] "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" از علامہ سید سلیمان ندوی انگریزی ترجمہ شائع شدہ جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی جلد ۴۳ مارچ تا جون ۱۹۴۳ء ص ۸۱ ڈاکٹر ایم، اے چغتائی نے اپنے مقالہ "مغل معماروں کا خاندان" اسلامک کلچر اپریل ۱۹۳۷ء ص ۲۰۲ پر اس پیراگراف کا ترجمہ ذرا مختلف ڈھنگ سے کیا ہے۔

محسوس ہوئی۔ اسی زمانہ میں ماہنامہ معارف میں ڈاکٹر ایم عبداللہ چغتائی کا مقالہ "تاج اور اس کی تعمیر" شائع ہوا۔ ۱۱ مارچ ۱۹۳۱ء کو سید صاحب نے ڈاکٹر چغتائی کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے چغتائی صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی کہ انھوں نے اپنے مذکورہ مقالہ میں استاذ احمد کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ سید صاحب نے اس خط میں یہ بھی دریافت کیا تھا کہ کیا ڈاکٹر چغتائی کو لطف اللہ مہندس کی تصنیفات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، ڈاکٹر چغتائی نے جواب میں عہد مغلیہ سے متعلق ایک ایسے خط کا حوالہ دیا جس میں شاہجہان اور عالمگیر کے عہد حکومت کا ذکر موجود ہے۔

یہ دلچسپ خط جس کا کاتب نامعلوم ہے عمدۃ الملک نواب جعفر خان کو بھیجا گیا تھا، یہ نواب مغلوں کی ملازمت میں تھا، اور بتدریج ترقی کرکے ۱۶۴۵ء سے ۱۶۵۶ء تک پنجاب کا گورنر رہا۔ اور دو سال بعد شاہجہاں کا وزیر مقرر ہوا، بعد میں اورنگ زیب نے بھی نواب جعفر خان کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ ۱۶۷۰ء میں اس نے وفات پائی۔[1]

اس خط کے مطالعہ کے بعد علامہ سلیمان ندوی نے ڈاکٹر چغتائی کو لکھا: "خدا کے فضل سے احمد معمار پر میرا مقالہ مکمل ہوچکا ہے، جعفر خان کے متعلق خط کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے آپ کے نام کا بھی تذکرہ کیا ہے، یہ مقالہ انشاءاللہ لاہور میں پڑھا جائیگا"

نواب جعفر خان سے متعلق یہ خط کافی طویل ہے، جس میں شمالی ہندوستان میں شاہی تعمیرات خصوصاً قلعہ شمشیر گڑھ کا مفصل تذکرہ موجود ہے، یہ خط کئی حیثیتوں سے

[1] اس خط کا مضمون، ڈاکٹر ایم عبداللہ چغتائی کے مقالہ "احمد معمار اور اس کا خاندان" میں موجود ہے۔

بڑی اہمیت کا حامل ہے، اور اس کا ثبوت ہے کہ عہد مغلیہ میں کتنے جامع تعمیراتی پلان پیش ہوتا تھا۔ خصوصاً شاہجہانی دور میں جب کہ مغل تعمیرات اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ چکی تھیں۔ مختلف چیزوں کے ماہرین اور نگران کا انتخاب بڑی ہوشیاری سے کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ مناصب پر فائز لوگوں کو انکی نااہلی پر فوراً موقوف کر دیا جاتا تھا۔ اہل ہنر، وفادار، ایماندار اور باصلاحیت افراد کی بڑی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ شعبۂ تعمیرات کو نہایت بااصول طریقہ پر منظم کیا جاتا تھا۔

یہ خط اس زمانہ میں لکھا گیا ہے، جب نواب جعفر خان پنجاب کے گورنر تھے گو اسکے کاتب کا نام معلوم ہے لیکن اس کا لب و لہجہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا لکھنے والا شاہجہان کا معتمد کوئی اعلیٰ درجہ کا افسر ہے۔ جس کو شاہ کے حضور میں خصوصی تقرب حاصل تھا، اس طرح اس خط کے کاتب کے نہ صرف ماہرین تعمیرات (جن میں استاد احمد بھی شامل ہیں) سے قریبی تعلقات تھے، بلکہ نواب جعفر خاں سے بھی اس کے اچھے مراسم تھے۔ جیسا کہ القاب کے بے تکلفانہ، دوستانہ اور آزادانہ انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہم پھر اپنے اصل موضوع کی طرف واپس آتے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنا اردو مقالہ "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" کے عنوان سے ۹ اپریل ۱۹۳۳ء کو لاہور کے ادارہ معارف اسلامیہ کی پہلی نشست میں پڑھا۔ یہ مقالہ اس ادارہ کی پہلی رپورٹ میں ۱۹۳۵ء میں اور بعد میں شبلی اکیڈمی کے آرگن ماہنامہ معارف فروری تا اپریل ۱۹۳۶ء میں بھی شائع ہوا۔ ۱۹۳۷ء میں سید صاحب موصوف کے ایماء پر سید صباح الدین عبدالرحمن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔[1]

[1] یہ انگریزی ترجمہ جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی کے شمارہ مارچ تا جون ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔

اس حقیقت میں قطعی دو رایوں کی گنجائش نہیں کہ علامہ سلیمان ندوی کا مذکورہ مقالہ بڑی قیمتی معلومات پر مشتمل ہے، دیوان ہندس کی روشنی میں سید صاحب موصوف نے انکشاف کیا ہے کہ استاذ احمد کے خانوادہ کے سبھی افراد بہ یک وقت فن تعمیر، نقشہ سازی انجینئرنگ علم ریاضی، فلسفہ، ہئیت و نجوم اور شعر و ادب مختلف فنون لطیفہ کے ماہر تھے۔ استاذ احمد کے تین فرزند تھے، عطاء اللہ، لطف اللہ اور نور اللہ۔ اس مخطوطہ کا مصنف یہی ثانی الذکر لطف اللہ ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے گرانقدر مقالہ کے خاص نکات درج ذیل ہیں،

۱۔ دیوان ہندس اس بات کو شک و شبہ سے بالاتر قرار دیتا ہے کہ تاج محل کے معمار استاذ احمد تھے، وہ عہد جہانگیری ہی سے ایک معمار اور کاریگر کی حیثیت سے شہرت عامہ حاصل کر چکے تھے، اور شاہجہان کے عہد میں لال قلعہ دہلی بنانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے، استاد احمد کا خاندان شاہزادہ داراشکوہ اور اس کے لڑکے سلیمان شکوہ کا کٹر حامی تھا۔ اور عالمگیر کے ہاتھوں داراشکوہ کی پسپائی کے بعد یہ خاندان شاہی عنایات سے محروم ہو گیا استاد احمد شاہجہان کے خاص شاہی معمار تھے، بادشاہ نے انھیں نادر العصر کا عظیم خطاب، ان کی اہلیت اور شاندار خدمات کو سراہتے ہوئے دیا تھا[1]

سید صاحب موصوف نے استاذ احمد کے اہل خاندان کی جو تفصیل دی ہے اس سے مندرجۂ ذیل شجرہ تیار کیا جاسکتا ہے۔

[1] جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی شمارہ مارچ تا جون ۱۹۴۶ء ص ۵، تا ۱۱۰،

استاد احمد
- نور اللہ معمار
- لطف اللہ ہندس
  - ابوالخیر خیر اللہ
    - محمد علی ریاضی
  - امام الدین ریاضی
- عطاء اللہ رشیدی
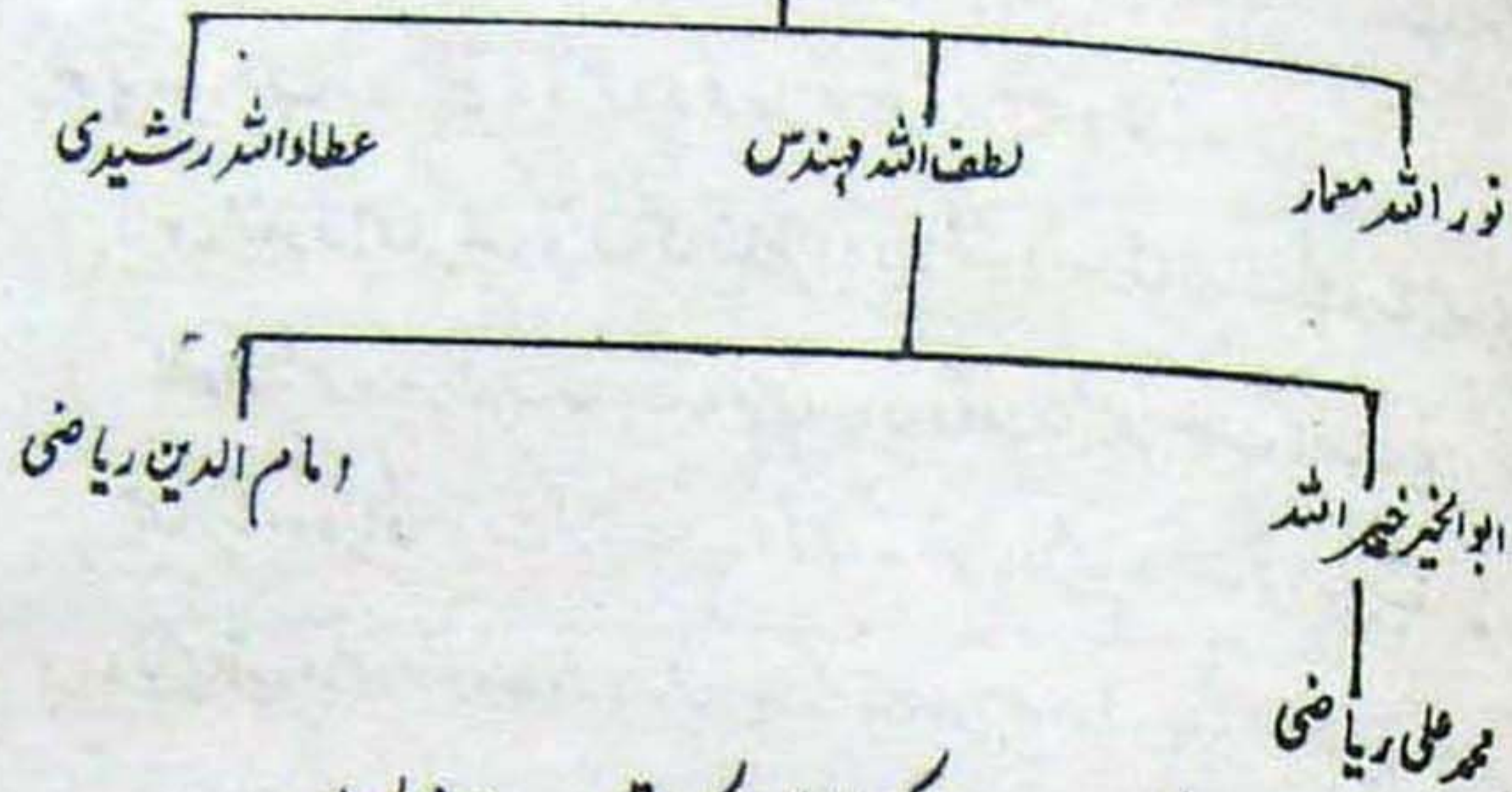
دیوان ہندس کے بارے میں کچھ قابل ذکر باتیں درج ذیل ہیں،

(۱) اس قلمی نسخہ کے ابتدائی دس صفحات کے چار قصائد میں سے دوسرا اور تیسرا قصیدہ شاہزادہ داراشکوہ اور غالباً اس کے لڑکے سلیمان شکوہ کی مدح میں ہے۔ جس میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ "شاہ کی عنایات اور نظر خاص کی بدولت فن تعمیر کا معیار میرے ذریعہ بہت بلند ہو گیا۔ داراشکوہ میں آسمان کی رفعت ہے۔ اور ان کے دل میں فیاضی کا دریا رواں ہے۔ جواہر کی طرح موتیوں کی بارش کرتا ہے"[1]

(۲) ایک مثنوی بھی کسی شاہزادے سے معنون ہے، اور یہ شاہزادہ بھی اغلباً داراشکوہ ہی ہے، مثنوی میں کہا گیا ہے کہ مصنف اس شاہزادے کے توسط سے شاہجہان تک پہنچنا چاہتا ہے۔

---

[1] مترجم:۔ یہ فارسی کے درج ذیل اشعار کے انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ ہے۔

بدستاری لطف شہ بلند اقبال	بلند پایہ زمن گشت قدر معماری
سپہر مرتبہ داراشکوہ دریا دل	کہ ہم چو ابر بکفش می کند گہر باری

(مقالات سلیمان تاریخی ص ۳۱۹)

؛ اگر شہنشاہ کا کوئی مقرب خاص میرا یہ پیغام بادشاہ کے کانوں تک اسوقت پہونچا دے جب وہ اچھے موڈ میں ہو تو خدا اسکو اجر عظیم دیگا۔؛ [1]

(۳) مخطوطہ میں ایک غزل بھی شاہزادہ داراشکوہ اور شاہجہاں کی مدح میں ہے۔

؛ داراشکوہ اور شاہجہاں بانی عالم ہیں۔ پروردگار اس عظیم سلطنت کا نگہبان ہو، جس طرح وہ دنیا کی حفاظت کرتا ہے آپ لوگوں کے اقبال کی بھی حفاظت فرمائے۔ جب تک دنیا میں آب و آتش موجود ہے۔ کرۂ ارض آپ کے قدموں پر سجدہ ریز رہے گا۔ اے عالم پناہ! ساری دنیا آپ کی مدح خوان ہے ادنیٰ کی اس مدح سرائی کو سنئے، کب تک ہندس کی حالت زلف یار کی طرح رہے گی، آپ ہی دنیا کے انتشار کو دور کر سکتے ہیں۔؛ [2]

۱۔ مترجم ۱: اصل فارسی اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

این سخن از مقیم این درگاہ — برساند بسمع حضرت شاہ
اجر باید کہ دگار کریم — نہ کہ اجر قلیل اجر عظیم

(مقالات سلیمان تاریخی ص ۳۲۴)

۲۔ مترجم: دیوان ہندس کے اصل فارسی اشعار جن کے انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ اوپر مذکور ہوا ہے۔

داراشکوہ، شاہجہان بانی جہان — بودے مبارک است سلیمانی جہان
پروردگار باد نگہبان دولتت — زانرو کہ کار تست نگہبانی جہان
تا آب و آتش است در وزن باد — روشن ز خاک پائے تو پیشانی جہان
اے بانی جہان کہ جہان در ثنائے تست — یک لحظہ گوش دار ثنا خوانی جہان
تا کے ہندس است پریشان چو زلف یار — اے از تو دور گشتہ پریشانی جہان

(مقالات سلیمان تاریخی ص ۳۲۴)

(۴) ایک قطعہ میں شہنشاہ کی یوں تعریف کرتا ہے: ؛ اے شہنشاہ تیرے مدح خوان کو جام جمشید کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں۔ معرفت حقیقی کے سرور میں مخمور کو شراب کی حاجت نہیں ہوتی۔ اگر آپ چاہتے ہوں کہ آپ کے محل کا معمار آپ کی توصیف کرے تو لطف اللہ کو اینٹ اور چونے کے کام میں مصروف نہ کیجئے۔؛ [1]

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ ہندس اور ان کا خاندان شاہجہاں کے مقربین خاص میں تھا، اور بعد میں شاہزادہ داراشکوہ کا حامی رہا، جیسا کہ دیوان ہندس کے نسخہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے ۱۶۵۰ء میں داراشکوہ کے لیے ایک محل تعمیر کیا اور ۱۶۵۲ء میں اس کے لیے ایک خاص کلید بھی تیار کی۔ یہ کنجی یقیناً بہت ہی مخصوص طرز کی رہی ہوگی اسی لئے دیوان ہندس میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے، قیاس ہے کہ غالباً یہ کنجی لطف اللہ ہندس کے تیار کئے ہوئے کسی خاص قسم کے تالے کی رہی ہوگی۔ یا پھر کوئی سونے کی کنجی رہی ہو۔

لطف اللہ اور ان کا خاندان شاہزادہ داراشکوہ کا انتہائی وفادار تھا، چنانچہ مصنف نے اس کی پرزور مدح کی ہے۔ اور شاہزادہ موصوف کے جانی دشمن عالمگیر پر طنز و طعن کے تیر بھی پھینکے ہیں، لطف اللہ نے داراشکوہ کی تعریف اس طرح کی ہے، ؛ یہ آپ کے خیر خواہوں کو خدا ہمیشہ عروج دے اور آپ کے دشمنوں کو خاک میں ملائے۔؛ [2]

۱۔ مترجم ۱: مخطوطہ کے اصل اشعار

ثنا خوان ترا شاہا چہ حاجت مدح جم گفتن — بجام بادہ حاجت نیست مست جام سرمد را
چو می خواہد کہ باشد بانی قصر ثنائے تو — بکار خشت و گل مگذار لطف اللہ احمد را

(مقالات سلیمان تاریخی ص ۳۲۵)

اورنگ زیب کے متعلق لکھتا ہے :" اے شہنشاہ آپ دادخواہوں پر توجہ نہیں دیتے، اور محتاجوں پر نظر کرم نہیں ڈالتے۔ میرے دشمنوں نے میرے قتل کا فتویٰ جاری کیا ہے، ورنہ آپ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا[1]۔

یہی وجہ ہے کہ جب عالمگیر زیب اورنگ شاہی ہوا تو شاہزادہ دارا شکوہ کی شدید حمایت کے سبب سے لطف اللہ اور اس کے خانوادہ کے حالات ناگفتہ بہ ہوگئے، اور ان کی جانیں اس حد تک خطرہ میں پڑگئیں کہ انھیں روپوش ہوجانا پڑا، ان حقائق کے پیش نظر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دیوان مہندس شب میں لکھا گیا کیونکہ دن میں لکھنے میں خطرہ تھا، باایں ہمہ اس کا بھی ثبوت موجود ہے کہ کچھ عرصہ بعد اورنگ زیب نے لطف اللہ کو اپنی ملازمت میں لے لیا تھا، جیسا کہ اس کتبہ سے ظاہر ہے جو سات انچ لمبا ۴½ انچ چوڑا دھات کا بنا ہوا سلاطین مالوہ کے پایہ تخت مانڈو میں بادشاہ ہوشنگ غوری کے مقبرہ کے صدر دروازے پر دائیں جانب نصب ہے، کتبہ میں ہے، کہ "۹ ربیع الثانی ۱۰۷۰ھ مطابق ۲۴ دسمبر ۱۶۵۹ء کو خاکسار لطف اللہ بن احمد شاہجہانی معمار اور خواجہ جادو راحے استاد شیورام اور استاد حامد اسے دیکھنے آئے تھے"۔

لطف اللہ مہندس کے خاندان پر شہنشاہ اورنگ زیب کی نظر عنایت ہونے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ لطف اللہ کے بڑے بھائی عطاء اللہ نے اورنگ زیب کی محبوب بیوی ملکہ رابعہ دورانی بیگم کے مقبرہ کی تعمیر کی تھی، جس کا انتقال ۱۶۵۷ء

---

[1] ترجمہ :- شہا گوش بر دادخواہی نداری · بحال گدایان نگاہے نداری
رقیبان بقتلم نوشتند فتویٰ · دگرنہ تو ہرگز گناہے نداری
(مقالات سلیمان تاریخی ص ۳۲۶)

میں ہوا تھا۔ اس مقبرہ پر تاج محل کی نقل میں یہ کتبہ لگا ہوا ہے،

" اس صدر دروازے کی تعمیر عزت مآب ابوالقاسم بیگ داروغہ کے زیر اہتمام ہوئی۔ اس شاندار مقبرہ کی تکمیل معمار عطاء اللہ کے ہاتھوں گورنر ہیبت رائے کے دور میں ۱۰۷۱ھ مطابق ۶۱-۱۶۶۰ء میں انجام پائی "۔

کیونکہ لطف اللہ نے دیوان مہندس کی تکمیل ۱۱۰۳ھ میں کی جو اورنگ زیب کی حکومت کا ۳۶واں سال تھا، اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ گو مصنف اور اس کے خاندان کے لوگ عالمگیر کی ملازمت میں آگئے تھے، تاہم مصنف کے جذبات میں کشیدگی اور لب ولہجہ میں ترشی باقی تھی ؛ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب مصنف کے حقیقی جذبات سے ناواقف تھا، لطف اللہ مہندس کے خلف الرشید امام الدین ریاضی نے لکھا ہے، کہ جب ان کی تصنیف تذکرہ باغستان ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء میں مکمل ہوئی تو اس وقت ان کے والد لطف اللہ بقید حیات نہ تھے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لطف اللہ مہندس کا انتقال ۱۱۰۳ھ کے اواخر یا ۱۱۰۴ھ کے اوائل میں ہوا۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے اس بات کا نہایت دلچسپ تجزیہ کیا ہے کہ کس طرح استاد احمد نادر العصر کا نام وقت کے ساتھ بدلتے بدلتے استاد عیسیٰ میں تبدیل ہوا، اور یہ مذکور ہوا کہ بعض جدید محققین نے کسی واضح ثبوت کے بغیر استاد عیسیٰ ہی کو تاج محل کا نقشہ نویس قرار دیا ہے۔

بہرکیف راقم سطور علامہ موصوف کے اس نظریہ سے متفق نہیں کہ " سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس (مخطوطہ) میں ہندو کاریگروں کو بھی

ساکن روم، بلخ، قندھار، اور سمرقند لکھا ہے، علی گڑھ یونیورسٹی، حیدرآباد، بھوپال
ندوہ اور دارالمصنفین کے کتب خانوں کے نسخوں اور ان کے علاوہ اور بھی جو نسخے
نظر سے گذرے۔ ان میں بھی یہ شجرہ گر بگی موجود ہے[۵۰]

حقیقت یہ ہے کہ دو ہزار سال قبل جب سے ہندوستان کا مذکورہ بالا مقامات
سے ثقافتی تعلق قائم ہوا ہندوستانی ماہرین فن نے بیرونی ممالک میں بڑی شہرت حاصل
کر لی تھی، اور وہ اکثر نمائش ہنر کے لیے وہاں مدعو کئے جاتے تھے۔ جہاں تک مسلم
تاریخ کا تعلق ہے ہمیں ساتویں اور آٹھوین صدی عیسوی میں بھی یروشلم میں ہندوؤں
کی موجودگی پتہ چلتا ہے۔ ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے پہلے ہندو فنکار، معمار
اور ماہرین کی وسط ایشیا میں بڑی قدر و منزلت تھی، کیونکہ وہ بڑے تجربہ کار اور
نقاشی سے مزین پتھر کی عظیم عمارتیں بنانے کے لیے بہت مشہور تھے جیسا کہ تزک بابری
سے ظاہر ہوتا ہے اس میں تیمور بیگ کی پتھر کی مسجد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا گیا ہے
کہ اس عمارت کی تعمیر میں دو سو سنگ تراشوں نے کام کیا، جو آذربائیجان، فارس
ہندوستان اور دوسرے ممالک سے آئے تھے[۵۱]۔ جب بابر ہندوستان وارد ہوا، اور
پہلے مغل حکمران کی حیثیت سے اس نے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی اسوقت وہ بہت سے
صنعت کار اور ماہرین فن بھی اپنے ہمراہ یہاں لایا، ان میں ایک بڑی تعداد ایسے
ہندوستانیوں کی بھی تھی جو اس کے ساتھ سمرقند و بخارا میں خدمات انجام دے چکے تھے[۵۲]

[۵۱] تاج محل اور لال قلعہ کے معمار انگریزی ترجمہ شائع شدہ جرنل آف دی بہار ریسرچ
سوسائٹی، مارچ تا جون [illegible]ء ص ۸، [۵۲] ملاحظہ ہو راقم سطور کا مقالہ تاج محل کس نے
تعمیر کیا، ماہنامہ دی مارگ، بمبئی، جنوری ۶۶ء ص ۶۰،

تزک بابری میں لکھا ہے،

"صرف آگرہ میں اسی شہر کے رہنے والے تقریباً ۶۸۰ سنگ تراشوں کو
میں روزانہ اپنے محل کی تعمیر میں لگاتا تھا، اور آگرہ، فتح پور سیکری، بیانہ، دھولپور،
گوالیار اور کوئل میں میرے کاموں پر ۱۴۹۱ سنگ تراش روزانہ لگائے
جاتے تھے"[۵۳]

عہد مغلیہ میں ہندو کاریگروں کا نام بھی مختلف شواہد میں ملتا ہے۔ چنانچہ
ہوشنگ شاہ غوری کے مقبرہ پر نصب ۱۶۵۹ء کے کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکے
معمار خواجہ جادو رائے، استاد شیو رام تھے، ایک دوسرا کتبہ ۱۶۶۲ء کا ہے اسکے
مطابق جوگی داس اور دیال داس تحویلدار دو ایسے معمار تھے، جنھوں نے بمقام مارگلہ
(راولپنڈی) شاہراہ سوری کی مرمت کی تھی۔

اب یہ بات مسلم ہو چکی ہے اور اس کے تاریخی ثبوت بھی موجود ہیں کہ عہد
قدیم سے ہی ہندو معمار، سنگتراش اور دیگر فنکار مختلف بیرونی ممالک کو جاتے
رہتے تھے، ان میں بہت سے اپنے پسندیدہ ملکوں میں مقیم بھی ہو گئے، ان فنکاروں
نے وہاں کے باشندوں کو اپنے فن سے روشناس کرایا، اور ہندو ثقافت
اور بیرونی تہذیب نے ملکر انڈونیشیا کے اسٹوپا، برما، کمبوڈیا، لنکا اور تھائی لینڈ
کے مندروں جیسے شاہکار پیدا کئے۔ اس طرح بہت سے ہندو معمار اور اہل ہنر
وسط ایشیا کے ان علاقوں میں بھی گئے، جسے اب مشرق وسطی کہا جاتا ہے،
کچھ عرصہ بعد جب ان میں سے کچھ لوگ اپنے آبائی وطن ہندوستان کو لوٹے تو

[۵۳] "ہندوستان میں مسلم حکومت کی مختصر تاریخ" (انگریزی) ایشوری پرشاد جلد ۲، ص ۶۶۰

خواہ ہندو تھے یا مسلمان ان کو اسی ملک کی طرف منسوب کیا جانے لگا جہاں سے وہ لوٹ کر آئے تھے۔ اس لئے یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے کہ ہمیں ہندوستانی تاریخوں میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ اور عہد مغلیہ کے فارسی مخطوطات میں ان کا ذکر موجود ہے، اسی وجہ سے ڈاکٹر ایم، عبداللہ چغتائی نے تاج محل کی نقاشی، تزیین اور آرائش و زیبائش پر تبصرہ کرتے ہوئے جو رائے ظاہر کی ہے اس سے اتفاق مشکل ہی، وہ لکھتے ہیں۔

"یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ سبھی طغرا نگار جن کا تذکرہ مسٹر ہیویل نے کیا ہے، وہی لوگ ہیں جن کا ذکر میرے پاس موجودہ فارسی کے مخطوطات میں بھی ملتا ہے، اور جو وسط ایشیا کے باشندے تھے، چنانچہ چرونجی لال کا وطن سمرقند بتایا گیا ہے، موہن لال روم (قسطنطنیہ) سے وابستہ خیال کئے جاتے ہیں اور منوہر سنگھ کا وطن بلخ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن راقم سطور کے خیال میں یہ بات ناممکن ہے میری رائے کے مطابق یا تو ان فنکاروں کے اسلامی نام بجائے کہ ہندو نام دے دیئے گئے ہیں یا پھر ان قلمی نسخوں کا سارا مواد جعلی ہے بہرکیف اطمینان بخش بات یہ ہے کہ مسٹر ہیویل کا بھی یہی خیال ہے"[1]

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ بابر سے لے کر شاہجہان تک کے پورے مغلیہ دور میں سبھی سلاطین علم و ہنر کے بڑے دلدادہ اور حسن کے بہت زبردست پرستار تھے، انھیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ یہ تخلیق کسی ہندو کی ہے یا مسلمان کی اور یقینی طور پر فارسی یا مغل مصنفین نے کسی ہندو کی تعریف اس وقت تک نہ کی ہوگی، جب تک وہ اس کا واقعی مستحق نہ رہا ہوگا، اور مسلمان مؤرخین نے تو اس کا تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ اسلامی ناموں کی جگہ ہندو نام رکھدئے جائیں۔ اس حقیقت کا بھی کافی

[1] تاج محل کی نقاشی، انگریزی مقالہ، از ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، اسلامک کلچر حیدرآباد، اکتوبر ۱۹۳۸ء ص ۴۶۹

ثبوت موجود ہے کہ مغلیہ دور کے مروج آرٹ کی تخلیق و تقلید میں ہندو کاریگر بھی بہت ماہر تھے۔ اس لئے میرے نزدیک ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا مذکورہ بالا نظریہ قابل قبول نہیں ہے۔

اور بالا کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عہد مغلیہ میں ہندو فن کاروں کو بھی مسلم خطابات مثلاً خواجہ اور استاد دیئے جاتے تھے، اور استاد کا لقب پانے پر ان کو وہی درجہ حاصل ہوتا تھا۔ جو استاد احمد اور استاد حامد کو حاصل تھا۔ اس خطاب کی اہمیت یہ تھی کہ ان فنکاروں کو کسی مخصوص فن یا ہنر میں پورا کمال حاصل ہوتا تھا، یہ بھی حقیقت ہے کہ مغل سلاطین مسلم خطابات ان غیر مسلموں کو بھی عطا کیا کرتے تھے، جو کسی خاص وصف کے باعث بادشاہ کے منظور نظر ہو جاتے تھے۔ مثلاً جے پور کے راجپوت شاہزادے راجہ جے سنگھ کو مرزا کا خطاب ہوا تھا،

(باقی)

وحشت اور جگر

از جناب شعیب عظیم، ڈھاکہ

یکم نومبر ۱۹۵۵ء کی ایک شام کو "دبستان فکر و نظر" ڈھاکہ کی ایک پرائیوٹ نشست میں یہ دلچسپ مسئلہ زیر غور رہا کہ فن اور تغزل کے لحاظ سے وحشت کلکتوی اور جگر مرادآبادی میں فوقیت کسے حاصل ہے اس تقابل کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ خالص علمی تجزیہ تھا، اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بغیر تجزیہ کیے ہوئے کسی مسئلہ کی گہرائی تک پہنچنا ممکن نہیں، شرکائے بزم کے بھی پیش نظر یہ باتیں تھیں۔ خوش گوار ماحول میں علمی بحث ہوئی۔ لیکن مسئلہ جہاں کا وہیں رہا۔ اس لیے طے پایا کہ مشاہیر ادب سے اس معاملے میں رجوع کیا جائے۔ چنانچہ ہند و پاک کے ادیبوں اور نقادوں سے استصوابِ رائیں حاصل کی گئیں یہاں یہ سب رائیں پیش کی جاتی ہیں جو یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں،

۱۔ علامہ آصف بنارسی ڈھاکہ (جانشین وحشت) خدا غریقِ رحمت کرے علامہ وحشت علیہ الرحمۃ کو مبدءِ فیاض نے فروغِ طبع کے ساتھ ساتھ حصولِ فن کا ذوق بھی بدرجۂ اتم عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ انھوں نے کافی ریاض کر کے اہل فن کے زمرے میں نہایت بلند مقام حاصل کیا۔ ان کا دیوان شروع سے آخر تک اعلیٰ تغزل اور کمالِ فن کا آئینہ دار ہے، ہر ہر شعر سے عالمانہ اور استادانہ شان منعکس ہوتی ہے۔

اللہ بخشے جگر مرادآبادی مرحوم فطری شعرا میں اچھا مقام رکھتے تھے، مگر حصولِ فن کیلئے

انھوں نے محنت نہیں کی، اس لیے ان کے کلام میں عالمانہ شان کم اور عامیانہ طرز زیادہ ہے۔ انھیں اہل فن میں اہمیت بھی اسی مناسبت سے حاصل ہے، اگرچہ اسمیں شک نہیں کہ ان کی زیادہ تر غزلیں والہانہ تغزل کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔

(مورخہ یکم دسمبر ۱۹۶۰ء)

۲۔ پروفیسر آل احمد سرور، صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ وحشت استاد ہیں جگر کے یہاں کہیں کہیں ناہمواری بھی ہے، فن کے لحاظ سے وحشت کا درجہ بلند ہے، مگر جگر ان سے بہت بہتر شاعر ہیں۔

(مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۶ء)

۳۔ ابو جعفر کشفی۔ کراچی آپ نے فرمائش کی ہے کہ میں حضرت وحشت مرحوم اور جگر صاحب کی غزل گوئی پر اپنی رائے ظاہر کروں اور یہ لکھوں کہ ان دونوں حضرات میں کون تغزل کے اعتبار سے فوقیت رکھتا ہے میں تعمیلِ فرمائش سے ان وجوہ سے قاصر ہوں۔

۱۔ فن عروض میں میری نظر نہایت محدود ہے۔ لہذا قابل استناد نہیں۔

۲۔ مدتوں سے میں خود غزل نہیں کہتا۔

۳۔ میں نے جگر صاحب کا کلام کم دیکھا ہے، جو دیکھا ہے وہ پرکھنے کی نظر سے نہیں

۴۔ حضرت وحشت مرحوم میرے استاد تھے، میرے دل میں ان کی عظمت بھی ہے، اور محبت بھی اور شاید محبت کا عنصر غالب ہے۔

لیکن میں کچھ بنیادی باتیں عرض کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ اگر آپ ان کو پسند کریں تو خود ایک صحیح نتیجہ پر پہنچ جائیں تغزل کے ارکان مسلمہ یہ ہیں۔

۱۔ سخن یار گفتن اور سخن با یار گفتن۔

۲۔ عشق اور اس کے متعلقات (روایتی عشق نہیں)

۳۔ حسن اور اسکے متعلقات (بازاری حسن نہیں)

۴۔ عاشق کے ذاتی حالات اور شخصی مشاہدات اور دلی جذبات وتاثرات

۵۔ زبان کی شستگی اور بیان کی سلاست۔

۶۔ پست اور مبتذل خیالات، معاملہ بندی اور نقاشی برہنہ سے ایسا پرہیز کہ شعر ماں بہن کے سامنے پڑھا جا سکے،

۷۔ قوانین عروض کی پابندی۔

ان باتوں کے علاوہ شاعر کا باعلم ہونا ضرور ہے ظاہر ہے کہ ایک بے پڑھے لکھے آدمی کے جذبات دلی اور مجسمات تخیلی نہ وسیع ہو سکتے ہیں نہ بلند۔ یہ بھی ضرور ہے کہ شاعر کا نفس اور عمل ارکان اخلاق حسنہ سے ٹکراتے نہ ہوں۔ ... شاعر کے اطوار وعادات کی جھلک اشعار میں ضرور دکھائی دے گی، اس شرط کی پابندی غزل گوئی میں آسان نہیں لیکن یہ یاد رہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" غزل کی نزاکت بداخلاق کے بوجھ کی متحمل نہیں۔ میں نے اپنے استادوں سے یہی سنا ہے۔

(مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۵۶ء)

۴۔ پروفیسر ارشد کاکوی مرحوم ڈھاکا کہ | جگر کے یہاں تغزل کی جو نرم ونازک مثالیں ہیں وحشت کے یہاں نہیں، وحشت کے یہاں فن ہے استادانہ رکھ رکھاؤ ہے قدرت کلام ہے، وقار ہے، شکوہ ہے، لیکن تیز داخلیت، شدید کیفیت اور رچا ہوا، تغزل نہیں۔ فن کے اعتبار سے وحشت صاحب کو فوقیت حاصل ہے

لہ یہاں کچھ نازیبا الفاظ تھے اسکو قلم زد کر دیا گیا ہے۔

اور یہ اعتبار تغزل جگر کو۔ (۱۶ مارچ ۱۹۵۹ء)

۵۔ پروفیسر اظہر قادری صدر شعبہ اردو جگن ناتھ کالج ڈھاکا | مولانا وحشت اور جگر مرادآبادی دونوں کہنہ مشق غزل گو شاعر ہیں اور اس لحاظ سے تغزل کے بنیادی عناصر دونوں کے یہاں موجود ہیں مگر اس کے یا وصف فطری طور پر دونوں کے تغزل میں بڑا بنیادی فرق ہے، یہ فرق دراصل ان کی ذہنی تہذیب وتربیت اور شعوری رجحان کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے۔ ذہنی طور پر وحشت کا تعلق غالب اسکول سے ہے اور اس لیے غالب کی فکری روایت کا غالب ورثہ وحشت کی شاعری کا اہم جزو بن گیا ہے، وحشت نے غالب کی طرز فکر سے جو کسب فیض کیا ہے اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے انداز تخیل میں ایک طرف بلا کی متانت او سنجیدگی آگئی ہے اور دوسری طرف انکی فکری کاوشوں میں غیر معمولی نظم وضبط پیدا ہو گیا ہے متانت وسنجیدگی او نظم وضبط کا یہی وہ احساس ہے جو وحشت کو جگر اور جگر جیسے دوسرے شاعروں سے الگ کرتا ہے،

اس کے برخلاف جگر کی شاعری دراصل داغ کی شاعری کی نہایت ترقی یافتہ شکل ہے، لیکن انداز بیان کی وہ شوخی اور زبان کا وہ چٹخارا جو داغ کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے، اور جس کی بنا پر داغ ہمیشہ زندہ رہیں گے، جگر کے یہاں مفقود ہے، البتہ داغ کے برخلاف جگر کا انداز والہانہ ہے جس کی وجہ سے عوام الناس کے لئے ان کی شاعری میں غیر معمولی کشش اور اپیل پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے یہاں تغزل کے کچھ اشعار ضرور ایسے ملتے ہیں جو بڑے بلند، چوکھے اور معرکے کے اشعار کہے جا سکتے ہیں۔

جہاں تک زبان وفن کا تعلق ہے وحشت کو اس پر مکمل عبور حاصل ہے وہ فنی مسائل سے کما حقہ آگاہ ہیں۔ الفاظ کی تحقیق، محاوروں کی تراش خراش اور صحت زبان پر ان کی نظر گہری ہے، جگر کے کلام میں زبان وفن سے بے اعتنائی کا شدت سے احساس ہوتا ہے،

فنی اعتبار سے ان کا کلام سند کے مرتبے تک مشکل ہی سے پہنچ پاتا ہے۔ اور اس کا احساس خود جگر کو بھی تھا، وہ وحشت کی استادانہ حیثیت کے معترف تھے، اور وحشت کی قادر الکلامی کو بڑی خندہ پیشانی سے صرف تسلیم ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ مخصوص ادبی نشستوں میں اسکا ذکر بھی کیا کرتے تھے، وہ جب بھی کسی مشاعرے کے سلسلے میں تشریف لاتے تو سب سے پہلے مولانا وحشت سے ملتے۔ ایک مرتبہ جب وہ یہاں آئے اور مولانا وحشت کے یہاں حسب دستور پہنچے تو مولانا وحشت نے ازراہ انکسار کہا کہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی تو جگر صاحب نے کہا کہ مولانا اگر میں نہ آتا تو تکلیف ہوتی، جگر صاحب جب بھی آتے تو مولانا وحشت کو اپنا تازہ کلام ضرور سناتے اور رائے چاہتے۔ ایک مرتبہ مولانا وحشت کو جگر اپنی غزل سنا رہے تھے، جب وہ اس شعر پر پہنچے۔ ؎

مری نظر نے شب غم انھیں بھی دیکھ لیا　　وہ بیشمار ستارے جو جگمگا نہ سکے

تو مولانا نے جگر صاحب سے کہا کہ دوسرے مصرع میں جو جگمگا اصل میں جگمگ ہو جاتا ہے، اور فصاحت کے خلاف ہے اس لیے "جو" کو "کہ" سے بدل لیجیے، جگر صاحب نے فوراً کہا کہ مولانا اسی کا نام استادی ہے، میری نظر اس باریکی تک نہ پہنچ سکی، اسی بنا پر جگر صاحب کی نظر میں مولانا وحشت کی بڑی قدر تھی، اور وہ ان کی بڑی عزت کرتے تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ میں مولانا وحشت کو اصغر گونڈوی مرحوم کی جگہ سمجھتا ہوں۔

مختصر یہ کہ وحشت کا انداز تغزل متین و سنجیدہ ہے، اور جگر کا والہانہ۔ زبان و فن کے لحاظ سے وحشت کا کلام استاد کی حیثیت رکھتا ہے اور جگر کے یہاں زبان و فن سے بڑی حد تک بے نیازی کا احساس ہوتا ہے، ویسے ذاتی طور پر

میرا خیال ہے کہ وحشت اور جگر میں تقابل ممکن نہیں۔

(۵ دسمبر ۱۹۶۰ء)

۶۔ تلوک چند محروم۔ دہلی | جو سوال آپ نے کیا ہے، اس کا جواب دینے سے قاصر ہوں وجہ اس کی یہ ہے کہ میں نے ان شعراء میں سے کسی کا کلام پورا نہیں پڑھا، چند غزلیں، ہر ایک کی پڑھی ہونگی اس سے نتیجہ منضبط کرنا خلاف مصلحت ہے۔

(۱۴ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

۷۔ تمکین کاظمی مرحوم، حیدرآباد دکن | جگر مرادآبادی، اور وحشت کلکتوی دونوں استاد ہیں، فن پر عروض دانی اور قابلیت اور عام معلومات کی وجہ سے وحشت کو بڑا عبور تھا، جگر اس پایہ کو نہیں پہنچے مگر بہ حیثیت غزل گو دونوں استاد اور اپنے فن کے ماہر اور کامل ہیں۔

یہ مسابقت اور مقابلہ کا طریقہ غلط ہے، ہر شاعر کا انفرادی رنگ ہوتا ہے اس رنگ سے اس کا اندازہ فرمائیے۔ دو شاعروں کو ٹکرا کر ایک کو ابھارنا غلط طریقہ تنقید ہے۔

(۹ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

۸۔ مولانا تمنا عمادی مرحوم ڈھاکہ | ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است۔ بقدر ضرورت فن وہ بھی جانتے تھے یہ بھی جانتے ہیں۔

(۱۰ اگست ۱۹۵۹ء)

۹۔ پروفیسر حامد حسن قادری مرحوم کراچی | جگر اور وحشت کا کوئی مقابلہ نہیں جیسے میر اور غالب کے متعلق یہ سوال نہیں ہو سکتا۔

(۷ مارچ ۱۹۵۹ء)

۱۰۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ سابق صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | مجھے افسوس اور ندامت ہے کہ آپ نے جس بحث میں حصہ لینے کی دعوت دی ہے، اس میں شرکت سے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

(۲ فروری ۱۹۵۹ء)

۱۱۔ شاہد احمد دہلوی مرحوم۔ مدیر "ساقی" کراچی | یہ لحاظ فن اور بہ اعتبار تغزل وحشت مرحوم کو جگر پر فوقیت حاصل ہے۔

(۱۰ اگست ۱۹۵۹ء)

۱۲۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | جگر اور وحشت فن میں دونوں استاد ہیں۔ مگر تغزل میں جگر اور فکر میں وحشت بڑھے ہوئے ہیں۔

(۲۳ نومبر ۱۹۵۹ء)

۱۳۔ سید طاہر علی شاکر کلکتوی مرحوم۔ کلکتہ | میں ایک معمولی شخص ہوں نہیں معلوم یہ سوال آپ کو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ بہر حال تعمیل ارشاد مجھ پر فرض ہے۔

میرے خیال ناقص میں نہ صرف حضرت جگر بلکہ دورِ حاضر کے تمام اساتذہ میں بہر لحاظ علامہ وحشتؔ کا پایہ بہت بلند ہے، حضرتِ جگر میرے کرم فرما ہیں۔ خود ان کا بھی یہی عقیدہ ہے، جس کا کئی ملاقات میں انھوں نے مجھ سے اظہار کیا۔

(۲۰ نومبر ۱۹۵۸ء)

۱۴۔ سید عابد علی عابد مرحوم۔ لاہور، | وحشت کلکتوی کو فوقیت حاصل ہے۔

(مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۵۹ء)

۱۵۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم۔ کراچی | مجھے اس قسم کے مباحث سے مطلق دلچسپی نہیں۔ ایسی بحثوں اور مقابلوں کو میں تضیع اوقات سمجھتا ہوں، جن لوگوں کے پاس وقت بہت ہے اور کام کچھ نہیں، یہ ان کے شوق کی چیز ہے۔ افسوس میں آپ کے ارشاد کی تعمیل سے قاصر ہوں۔

(۲۸ ستمبر ۱۹۵۹ء)

۱۶۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی | سوال میرے لیے مشکل ہے اس لیے اور بھی کہ میں نے وحشت کا کلام بہت کم پڑھا ہے۔ اجمالی طور پر دونوں ہی کو بلند پایہ غزل گو سمجھتا ہوں۔

(۱۲ نومبر ۱۹۵۸ء)

۱۷۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور | تغزل اور فن کے لحاظ سے جگر کا مقام بلند ہے کسی بھی شاعر یا ادیب کے علمی اور ادبی مقام کا تعین کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔

(۷ نومبر ۱۹۵۸ء)

۱۸۔ پروفیسر عبدالمنان بیدل۔ صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ | آپ کا سوال وضاحت طلب ہے اس لئے کہ "فن اور تغزل" جو دو الفاظ آپ نے استعمال کئے ہیں۔ مختلف اور ایک گونہ متباین معانی و مفہوم کے حامل ہیں، "فن شعر" اور "تغزل" کو ترقی پسند نقادوں نے اتنی وسعت دے رکھی ہے کہ اس میں ساری دنیا اب ان میں سمائی جا سکتی ہے، میں آپ کے سوال علامہ جمیل مظہری صاحب کو بھی دیئے۔ جواب ملا میں ان کا جواب دینا نہیں چاہتا ہوں۔ وجہ دریافت کی

کہا گیا کہ انصاف اور حقیقت اور مروت اور صداقت کی کشمکش۔ انکا اجتناب واحتراز بجائے مین نے ان کو معاف کر دیا۔ جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے اور میری وجہ بلا وجہ نہیں ہے تو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ وحشتؔ کے رنگِ تغزل کو جگرؔ اپنا نہ سکے اور میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ وحشتؔ کے کلام میں "تغزل" بہ مفہوم خاص جگرؔ سے کہیں زیادہ ہے، فن کے لحاظ سے بھی وحشتؔ کا پایہ جگرؔ سے بلند ہے۔ ہاں بحیثیت "شہرت" کے وحشتؔ جگرؔ کے گرد کو بھی نہیں پہونچتے۔

(۲۰ مارچ ۱۹۵۹ء)

۱۹۔ قاضی عبدالودود۔ پٹنہ | وحشتؔ اور جگرؔ کا رنگ الگ الگ ہے بحیثیت مجموعی کسے ترجیح حاصل ہے اس کا فیصلہ ہو بھی سکے تو اس کے لیے پہلے دونوں کے دوادین کے استیعاب مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اور یہ میں نے نہ کیا ہے اور نہ مستقبل قریب مین اس کا ارادہ ہے۔

(۸ اپریل ۱۹۵۹ء)

۲۰۔ پروفیسر عندلیب شادانی مرحوم۔ صدر شعبۂ اردو وفارسی ڈھاکا یونیورسٹی | میرے ایک کرم فرمانے جو وحشت صاحب مرحوم سے بہت خصوصیت رکھتے تھے، اور جگر صاحب سے بہت خصوصیت رکھتے ہیں، اور ساتھ ہی ایک مشہور خوش گو شاعر اور صاحب نظر نقاد ہیں۔ ایک موقع پر فرمایا تھا کہ "بڑے استاد وحشت اور بڑا شاعر جگر" اور مجھے اس رائے سے اتفاق ہے۔

(۹ فروری ۱۹۵۹ء)

۲۱۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم۔ لاہور | استفسار کا جواب عرض کرنے میں متامل ہوں

اس لیے کہ وثوق سے رائے اس وقت دی جاسکتی ہے جب امور مستفسرہ کے متعلق اتنی واقفیت ہو جس کی بنا پر رائے قائم کرنا خالی از خدشہ نہ رہے۔ میں نے بعض مشہور اساتذہ کا کلام تو ایک حد تک بالاستیعاب پڑھا ہے مثلاً غالب، اقبال، حالی، امیر مینائی، داغ، ذوق، میر انیس، بعض کو جستہ جستہ دیکھا ہے، مثلاً سودا، میر، میر درد، مومن، شیفتہ، ناسخ، آتش وغیرہ لیکن متاخرین کا کلام دیکھنے کا موقع بہت ہی کم ملا ہے بس کبھی کبھار کسی رسالے یا اخبار میں کوئی چیز چھپی اور پڑھ لی، ظاہر ہے کہ ایسی سرسری معلومات مستند و محکم رائے کا مبنی نہیں بن سکتیں،

مینے جگر کے اشعار زیادہ پڑھے ہیں، اگرچہ مجلسوں یعنی مشاعروں میں کبھی نہیں سنے اس لیے کہ مشاعروں میں جانے کا عادی میں نہیں، وحشت مرحوم کا کلام بھی بارہا دیکھا ہے، ایک مرتبہ ان سے ڈھاکا میں ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا تھا، وہ بڑے پختہ کار اور کہنہ مشق شاعر تھے، لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ جگر کے اشعار ان سے بہتر ہوتے ہیں یعنی فی الجملہ البتہ فن اور تغزل کی قید کے ساتھ دونوں کے کلام بلاغت نظام کا تقابلی مطالعہ کبھی نہیں کیا،

(۹ نومبر ۱۹۵۸ء)

۲۲۔ فراق گورکھپوری۔ الہ آباد | جگر اور وحشت کلکتوی میں فوقیت جگر کو ہے، لیکن وحشت کا کلام بھی بہت قابل قدر ہے،

(۸ فروری ۱۹۵۹ء)

۲۳۔ ڈاکٹر محمد باقر۔ صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور | وحشت کلکتوی فن اور تغزل کے اعتبار سے جگر مرادآبادی سے کہیں بہتر ہیں۔

(۲۸ اگست ۱۹۵۹ء)

۲۴۔ چودھری محمد علی ردولوی مرحوم۔ ردولی | رضا علی وحشت مرحوم بہت کہنہ

مشق پختہ گو شاعر تھے، ان کا کلام تحویل حافظہ میں تھا، مگر فالج سب لوٹ کرلے گیا،
جگر صاحب کی شاعری کا نمونہ میں نے دیکھا ہے، جب اصغر گونڈوی مرحوم زندہ
تھے، تو جگر کے کلام پر اعتنا کم ہوتی تھی، مگر نقاد اس وقت بھی سمجھتے تھے کہ جگر
مین کوئی بات ایسی ہے جو اصغر (مرحوم) کو بھی نصیب نہیں، جو شخص خود شاعر
نہ ہو وہ شعر کے مشکلات سے کیا واقف ہو سکتا اس لئے مجھ کو جرأت نہیں کہ مین
ان دونوں میں مقابلہ کروں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اگر میں شاگرد ہوتا تو وحشت
مرحوم کا شاگرد ہوتا اور شعر جگر کے رنگ میں کہتا۔

(۱۴ر نومبر ۱۹۵۸ء)

۲۵۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم۔ حیدرآباد (دکن)، وحشت اور
جگر اپنے اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ جگر کے کلام کو ان کے طرز ادا اور پڑھنے کے
انداز نے اور زیادہ مقبول بنا دیا ہے۔

(۳ر مارچ ۱۹۵۹ء)

۲۶۔ ڈاکٹر منوہر سہائے انور، (صدر شعبۂ فارسی، اردو و عربی پنجاب یونیورسٹی، کیمپ کالج۔ نئی دہلی) وحشت کلکتوی کو فن کے لحاظ سے
کامل فن کہا جا سکتا ہے۔ جگر مرادآبادی اصول فن کے زیادہ پابند نہیں، وحشت کا کلام پختہ
اور استادانہ ہے مگر اس میں جدت افکار کی کمی پائی جاتی ہے، یعنی وہی مضامین
جو مدت سے بندھتے چلے آرہے تھے، ان کے کلام میں بھی بہ کثرت نظر آتے ہیں،
جگر کے افکار میں تازگی کے علاوہ وسعت بھی ہے، فن اور صحت زبان کے اعتبار
سے وحشت کا رتبہ بلند ہے۔ اور جدت فکر کے لحاظ سے جگر بڑھے ہوئے ہیں،

تغزل دونوں کے کلام میں رچا ہوا ہے، فرق اتنا ہے کہ وحشت کا تغزل روایتی اور جگر
کا انفرادی ہے،

(۵ر مارچ ۱۹۵۹ء)

۲۷۔ نصیر الدین ہاشمی مرحوم، حیدرآباد دکن وحشت کلکتوی کو فن کے لحاظ سے
اور جگر مرادآبادی کو تغزل کے لحاظ سے میں ممتاز تصور کرتا ہوں،

(۳۱ر اگست ۱۹۵۹ء)

۲۸۔ علامہ نیاز فتحپوری مرحوم۔ مدیر ماہنامہ نگار لکھنؤ فن اور تغزل کے
لحاظ سے وحشت کا شمار اساتذہ میں ہے، اور جگر کا محض اچھے شعراء میں،

(۲ر اگست ۱۹۵۹ء)

کیا بیدل، عظیم آبادی نہ تھے؟

از

از جناب احسن الظفر صاحب ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی

"بیدل کے وطن کے بارہ میں حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک محققانہ مضمون معارف میں شائع ہوا تھا، اس مضمون میں بھی اس سلسلہ میں بعض مفید معلومات ہیں، اس لئے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔" "م"

مرزا عبدالقادر بیدل کا شمار ہندوستان کے عظیم ترین فارسی گو شاعروں میں ہوتا ہے، بیدل ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۱۳۳ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔ بیدل کی جائے پیدائش عرصہ سے موضوع بحث رہی ہے، اور ابھی تک دانشوروں کے حلقے میں ایک دلچسپ موضوع کی حیثیت حاصل ہے، اس مضمون میں اس مختلف فیہ مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تذکرہ نویسوں میں شیر خاں لودی بیدل کے معاصر ہونے کے علاوہ اُن کے دوست بھی رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں: "وہ (بیدل) ہندوستان میں نشو ونما پائے"[۱] بندرابن داس خوشگو، بیدل کے شاگرد اور ارادتمند، جنھوں نے اپنے بیان کے مطابق ایک ہزار دفعہ سے زیادہ بیدل کی صحبت سے فائدہ اٹھایا ہے، اور مرزا بیدل کے حالات نسبتہً زیادہ تفصیل سے بیان کئے ہیں، لکھتے ہیں: "بیدل اکبرآباد کے رہنے والے تھے"، مزید لکھتے ہیں، طاہر نصرآبادی نے جوان کے وطن کے سلسلے میں

[۱] مرأۃ الخیال ص ۳۵۹،

لکھا ہے کہ لاہوری ہیں، اس کی کوئی بنیاد نہیں"[۲] مرزا قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں بیدل ایرانی الاصل ہیں[۳] نظامی بدایونی لکھتے ہیں: "بیدل کا اصلی وطن توران ہے، اور بخارا میں پیدا ہوئے"[۴]

ان اقوال کے مقابلے میں تذکرہ نگاروں کی اکثریت بیدل کو "عظیم آبادی" لکھتی ہے، ان میں میر غلام علی آزاد بلگرامی سر فہرست ہیں، جو خوشگو کے بیان سے بھی واقف تھے[۵]، ان کے علاوہ علی ابراہیم خاں خلیل[۶]، حسین قلی خاں[۷]، قدرت اللہ گوپاموی[۸]، بھگوان داس ہندی[۹]، عبدالغنی[۱۰] اور عبدالوہاب افتخار[۱۱] وغیرہ ہیں:-

بیدل کی نثری تصنیف "چہار عنصر" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھر ہندوستان ہی میں رہے، کسی بیرونی ملک کا دورہ نہیں کیا۔ اپنی جائے پیدائش کے سلسلے میں وہ کوئی واضح بیان نہیں دیتے، البتہ کچھ اشارے ملتے ہیں جن سے ایک نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے، یہ اشارے درج ذیل ہیں:

بیدل دور طفولیت میں اپنے چچا مرزا قلندر کے ہمراہ رانی ساگر گئے، اور وہاں سے سرائے بنارس پہونچے، یہ دونوں قصبے اس وقت آرہ (بہار) اور شاہ آباد ضلع میں پڑتے ہیں۔ وہاں سے آرہ آئے[۱۲] ۱۰۶۹ھ میں اپنے چچا مرزا قلندر اور مرزا عبداللطیف کے ہمراہ ترہت میں مقیم تھے، مرزا عبداللطیف شاہ شجاع کی فوج میں ایک دستہ کے کمانڈر تھے، شجاع کی فوج جب اورنگ زیب کی فوج سے آویزش کے بعد ہار گئی تو مرزا عبداللطیف بھی انتشار کے شکار ہو کر ایک طرف کو بھاگے، مرزا بیدل اُن کے ہمراہ حیران و سرگرداں پٹنہ پہونچے، اور وہاں سے چاندپور آئے[۱۳]، چاندپور پٹنہ کے پاس ہی واقع ہے چند دنوں بعد مقام "کسی" پہونچے[۱۴]، کسی چمپارن ضلع کا ایک قصبہ ہے، ۱۰۷۱ھ میں مرزا قلندر کے ہمراہ

[۲] سفینۂ خوشگو دفتر ثالث ص ۱۰۴، [۳] مجموعۂ نغز، [۴] قاموس المشاہیر ج ۱ ص ۱۴۶
[۵] خزانۂ عامرہ ص ۱۵۲، [۶] صحف ابراہیم ص ۱۴۳ [۷] نشتر عشق ص ۳۱۲ [۸] نتائج الافکار
[۹] سفینۂ ہندی ص ۲۸ [۱۰] تذکرۃ الشعراء [۱۱] تذکرہ بےنظیر [۱۲] کلیات بیدل نولکشور ص ۳۰ [۱۳] ایضاً ص ۵۵ [۱۴] ایضاً ص ۵۶۲

بنگال روانہ ہوئے،

اس ترتیب سے بیدل ۱۶ سال کی عمر تک بہار میں تھے، اُن کی زندگی کا یہ دور رانی ساگر آرہ، سرائے بنارس، ہسی، ترہت اور پٹنہ کے اردگرد گذرا، یہ سارے علاقے صوبہ بہار ہی میں واقع ہیں، اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انہی میں سے کسی ایک جگہ پیدا ہوئے اور وہ جگہ عظیم آباد (موجودہ پٹنہ) کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتی، کیونکہ اس کے اطراف کا تذکرہ بطور سیرگاہ کے آیا ہے،[51] شاد عظیم آبادی نے "نوائے وطن" میں اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ہمارے دعویٰ کی تائید کرتا ہے:۔

"جو نقلیں اپنے اگلے بزرگوں سے سنی ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ مرزا صاحب خاص عظیم آباد کے رہنے والے تھے، اور پنڈ باہی محلہ اُن کا مسکن تھا۔[52]

جس زمانے میں ناچیز کا قیام پٹنے میں تھا، وہاں کے دانشوروں کے سامنے موضوع رکھا جس کا ماحصل درج ذیل ہے:۔

سب سے پہلے قاضی عبدالودود صاحب سے ملاقات کی، موصوف کا شمار ہندوستان کے مشہور محققوں میں ہوتا ہے، خصوصاً فارسی اور اردو ادبیات اور تاریخ پر اُن کی اچھی نظر ہے، انھوں نے فرمایا،

"اس سلسلے میں نقل سے زیادہ ہمیں اپنی عقل پر اعتماد کرنا چاہئے، اتنی بات مسلّم ہے کہ تذکرہ نویسوں میں صرف ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو براہ راست نقل کرتا ہے باقی نقل در نقل کرتے ہیں، یہاں بھی دیکھنا ہوگا کہ براہ راست نقل کرنے والا کون ہے، ایسا آدمی صرف خوشگو نظر آتا ہے جس نے یہ قول خود ایک ہزار دفعہ سے زیادہ مرزا کی صحبتوں میں حاضری دی، اور استفادہ کیا، وہ بیدل کو "اکبرآبادی" لکھتا ہے، جب کہ غلام علی

---

[51] بیدل نے شاہ یکہ آزاد کے حالات کے سلسلہ میں ایک جگہ اپنے متعلق لکھا ہے "جن دنوں قصبہ آرہ میں ہمارا اتفاقی قیام تھا"، کلیات بیدل ص ۳۱۹، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سب مقامات میں گردش کیا کرتے تھے۔

[52] نوائے وطن ص ۱۱

آزاد اور دوسرے تذکرہ نگاروں کو ایک دفعہ بھی بیدل سے ملاقات نصیب نہیں ہوئی ہے، وہ انھیں عظیم آبادی لکھتے ہیں، آپ خود ہی انصاف کیجئے کس کی بات زیادہ قابلِ اعتماد ہوگی رہے، شاد جنھوں نے محلّے تک کی تعیین کردی ہے، تو معلوم ہونا چاہئے کہ انھوں نے بہت سی جگہ غلطیاں کی ہیں، یہاں صرف وطن پرستی کے جذبے سے کام نہیں چلے گا، تذکرہ نگاروں کے ہر قول کو عقل و فہم کے ترازو میں تولنے کی ضرورت ہے"

قاضی عبدالودود صاحب کے بعد پروفیسر عطاء الرحمٰن صاحب عطا کاکوی کی خدمت میں حاضر ہوا، کاکوی صاحب پٹنہ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ فارسی اور فارسی و عربی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائرکٹر ہیں، بیدل اُن کا خاص موضوع رہا ہے، اور اس سلسلے میں اُن کی معلومات نہایت وسیع اور عمیق ہیں، انھوں نے "حیرت زار" نام کی ایک کتاب بھی لکھی ہے، غرض قاضی عبدالودود صاحب کی ملاقات کی ساری تفصیلات اُن کے سامنے رکھیں، جناب کاکوی صاحب نے فرمایا:۔

"جس شاعر کو اکثر تذکروں میں عظیم آبادی لکھا گیا ہے اگر وہ بطور مسافرت کبھی اکبرآباد یا دہلی پہنچتا ہے، تو اُسے اکبرآبادی یا دہلوی نہیں کہا جا سکتا، جس طرح کوئی اکبرآبادی ہو اور کبھی عظیم آباد آجائے تو اُسے عظیم آبادی نہیں کہا جا سکتا، غلام علی آزاد نے اپنے تینوں تذکروں (سرو آزاد، خزانۂ عامرہ[53] ید بیضا) میں بیدل کو "عظیم آبادی" لکھا ہے، جبکہ خوشگو کے بیان سے باخبر تھے بلکہ خوشگو نے اپنا تذکرہ "سفینۂ خوشگو" آزاد ہی کے حسب ہدایت لکھا ہے اس کے باوجود وہ بیدل کے عظیم آبادی ہونے پر کیوں مصر ہیں، ؟

پروفیسر میر حسن شاہ صدر شعبۂ فارسی کابل یونیورسٹی اپنے ایک مقالہ بعنوان "بیدل" میں جو مجلۂ ادب کابل میں چھپا ہے، لکھتے ہیں:-

"دہلی کو اس لحاظ سے بیدل کا وطن کہہ سکتے ہیں کہ بیدل نے آخری دور حیات میں وہیں قیام کیا ہے"[۵۱]

لیکن وطن اگر جائے پیدائش کا نام ہے تو دہلی کو وطن نہیں کہا جاسکتا، ورنہ جہاں کہیں بھی زندگی کا کوئی مخصوص دور گزرا ہے، اسے اس لحاظ سے وطن کہا جاسکتا ہے،

اوپر کی تفصیل سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بیدل کے ایام طفولیت ۱۶ سال کی عمر تک بہار کے مختلف علاقوں اور شہروں میں گذرے ہیں، انہی حقائق کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے مشہور محقق علامہ سید سلیمان ندوی نے کسی مخصوص جگہ کی قید لگائے بغیر لکھا ہے کہ:-

"بیدل کا مولد و منشاء بہار رہا ہے، اُن کا بچپن اور جوانی کا دور یہیں گذرا ہے"[۵۲]،

بیدل کی زندگی کا پہلا دور جب متفقہ طور پر بہار میں گذرا ہے، تو یقیناً انہی مقامات میں سے کسی جگہ وہ پیدا ہوئے ہیں، اور وہ عظیم آباد کے سوا دوسری جگہ اس لئے نہیں ہوسکتی کہ کم از کم کوئی بھی تذکرہ نویس خصوصاً بہاری تذکرہ نویس مثلاً علی ابراہیم خاں خلیل صاحب "صحف ابراہیم" اور حسین قلی خاں صاحب "نشتر عشق" اسے نظر انداز نہیں کرسکتے تھے،

رہا خوشگو کا بیان جسے قاضی ودود صاحب مستند تر سمجھتے ہیں، تو وہ غلط فہمی پر مبنی ہے،

[۵۱] مجلۂ ادب کابل سال نزدہم ۱۳۵۰ ش [۵۲] نقوش لاہور شخصیات نمبر ص ۱۳۴۱،

کیونکہ اس قدر قریب تعلق کے باوجود خوشگو نے مرزا کے بعض حالات غلط لکھے ہیں جس کا اندازہ چہار عنصر سے مقابلہ کرنے پر ہوتا ہے، مثال کے طور پر درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو، خوشگو لکھتے ہیں:-

"چوں از رضاع برآمد، و قدم بہ پنج سالگی داشت، زبان راکہ از اعضاء رئیسۂ انسانست بختم کلام مجید شادابی بخشید و در اواسط ہماں سال مرزا عبدالخالق رخت ہستی بربست .... در سال ششم از عمر از خدمت والدہ ماجدہ حروف تہجی آموخت"[۵۳]	جب شیر خوارگی کی حد سے باہر نکلے، اور پانچویں سال میں قدم رکھا، زبان کو، جس کا شمار انسان کے اعضاء رئیسہ میں ہوتا ہے، قرآن مجید ختم کرکے تازگی بخشی، اسی سال کے وسط میں (یعنی ۵ ½ کی عمر میں) مرزا عبدالخالق کا انتقال ہوا ...... چھ سال کی عمر میں اپنی والدہ ماجدہ سے حروف تہجی سیکھے،

مرزا بیدل لکھتے ہیں:-

"باندک تحریکے از نسیم فرصت والد مجازی بسیر گلشن حقیقت شتافت .... زمانے	نسیم فرصت کے معمولی جھونکے سے والد مجازی چمن حقیقت کی تفریح کو روانہ ہوئے، ....

[۵۳] سفینۂ خوشگو دفتر ثالث ص ۱۰۵

"چند بوضع بے سرو پائی گذشت! در مبادی شہر سادسہ از سال سادس والدہ مشفقہ ....باستفادۂ خدمت اساتذہ مرو ش معنی گردید و باستفہام ابجد تہجی عنان توجہ منعطف گردانید......... بامداد تربیتش ہفت ماہ تردد انفاس توام ورق گردانی بود .... ورنہایت حول مسطورمیت فضل واہب العطیات زبان عجز بیان را باختتام قرآن مجید فائز گردانید....."[1]

کچھ دنوں کیف ما اتفق زندگی گذاری، چھٹے سال کے چھٹے مہینے کی ابتدا، (چھ سال پانچ مہینے اور چند دن کی عمر) میں مادر مہربان اساتذہ کی خدمت میں استفادہ کے لئے فرشتہ معنی ثابت ہوئیں (اساتذہ کی طرف رجوع کیا،) اور حروف تہجی کی شناخت پر اپنی توجہ مرکوز کی.......... ان کے زیر تربیت سات مہینے تک نفس کی آمد و شد کتاب کی ورق گردانی سے ہم آہنگ رہی.... ...... درج بالا سال کے آخر میں خدا کے فضل و کرم سے زبان عجز بیان کو قرآن مجید ختم کرکے مشرف کیا،

مرزا بیدل اور خوشگو کے اقتباسات کا تقابلی مطالعہ کیجئے تو ظاہر ہوتا ہے کہ:

[1] کلیات بیدل ص ۳۰۰ - ۳۰۱

خوشگو	بیدل
۱- والد کی وفات اس وقت ہوئی، جب کہ بیدل کی عمر ساڑھے پانچ سال کی تھی،	۱- والد کی وفات جب ہوئی جب کہ بیدل کی عمر تقریباً پانچ سال تھی،
۲- تعلیم کے لئے پہلے والدہ نے اپنے پاس بٹھایا،	۲- والدہ نے اساتذہ کی طرف رجوع کیا،
۳- قرآن پانچ سال کی عمر میں ختم کیا،	۳- قرآن پورے سات سال کی عمر میں ختم کیا،

لہذا خوشگو کے سارے بیانات کو آنکھ بند کرکے نہیں ماننا چاہئے زیادہ سے زیادہ پروفیسر میر حسن کی طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبرآباد بیدل کا وطن اس لحاظ سے ہے کہ اُس نے زندگی کے کچھ دن وہاں گذارے ہیں، اگر وطن اسی کا نام ہے، تو پھر اکبرآباد اور دہلی ہی کیوں، متھرا، بنارس، میوات، کٹک، حسن ابدال، پٹنہ، ترہت اور بہار کے تمام وہ قصبات جہاں زندگی کے مختلف ادوار گذرے ہیں سب کو وطن کہنا چاہئے،

مطبوعاتِ جدیدہ

اخلاق الوزیرین ، (عربی) تالیف ابوحیان علی بن محمد توحیدی، تحقیق و تحشیہ محمد بن تاویت طنجی، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، قیمت تحریر نہیں۔ پتہ المجمع العلمی العربی دمشق

ابوحیان علی بن محمد توحیدی چوتھی صدی ہجری کا نامور عربی مصنف اور مشہور ادیب و انشا پرداز تھا، یہ اس کی اہم اور ادب و محاضرات کی بلند پایہ کتابوں میں ہے، اس میں اس نے آل بویہ کے دو ممتاز انشا پرداز وزیروں کی اس لیے ہجو لکھی ہے، کہ جب وہ ان کے پاس بغداد سے رے پہنچا تو انھوں نے اس کی کوئی پذیرائی اور قدردانی نہ کی۔ اس میں اس نے انکے بعض محاسن و کمالات بھی لکھے ہیں لیکن اصلاً مثالب بیان کئے ہیں، اور جاحظ وغیرہ کی طرح بات میں بات پیدا کرکے دوسری گوناگوں دلچسپ و مفید و حکیمانہ باتیں بھی قلمبند کی ہیں، مقدمہ میں مصنف نے دونوں کی مذمت تحریر کرنے کے جواز اور اسباب پر بڑی دلچسپ گفتگو کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح محسن کو ملامت کرنا ناروا ہے اسی طرح بدسلوکی کرنے والے کی مذمت کرنا مناسب ہے، پوری کتاب نہایت دلچسپ اور شعر و ادب کے نکات پر مشتمل ہے مصنف کی انتہا پسندی اور مبالغہ آرائی سے قطع نظر ہر جگہ اس کی ذہانت و طباعی، تخئیل کی ندرت، استدلال کی قوت اور زوربیان کے دلاویز نمونے موجود ہیں، غالباً اس کتاب کا ایک ہی قلمی نسخہ استنبول کے کتب خانہ اسعد آفندی میں پایا جاتا ہے، محمد بن تاویت طنجی نے اس کو تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کیا ہے، شروع میں ان کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے۔ اس میں کتاب کے نام اور سبب تصنیف وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے، اور حاشیہ میں حوالوں کی تخریج، لغات کی تحقیق اور اسماء اعلام کے مختصر تراجم قلمبند کئے گئے ہیں۔ آخر میں آٹھ مختلف فہرستیں دی گئی ہیں، اس ادبی و علمی کتاب کی اشاعت پر فاضل مرتب اور المجمع العلمی العربی دمشق دونوں شکریے کے مستحق ہیں۔

. . . . پاجا سراغ زندگی۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۶۰، مجلد مع گردپوش قیمت للعہ پتہ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس نمبر ۹۳ لکھنو۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء دارالعلوم کے تعلیمی سال کے آغاز و اختتام پر عموماً طلبہ سے خطاب کرتے ہیں، یہ رسالہ ان ہی خطابات کا مجموعہ ہے، دو تقریروں میں دارالعلوم دیوبند اور ایک میں جامعہ رحمانیہ مونگیر کے طلبہ سے خطاب کیا گیا ہے، ایک مختصر تقریر میں مولانا مسعود علی ندوی مرحوم سابق منیجر دارالمصنفین کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، اس کے سوا سب تقریروں کا موضوع یکساں ہے یعنی طلبہ کے اصلی فرائض، عالمانہ و داعیانہ ذمہ داریاں، موجودہ حالات سے عہدہ برآ ہونے اور عصری فتنوں کا مقابلہ کرنے کی صورتیں اور تدبیریں وغیرہ، اس سلسلہ میں عربی مدارس کے مقاصد اور علم دین کی اہمیت و عظمت واضح کرکے طلبہ کو احساس کمتری اور پست ہمتی دور کرنے اور عالی حوصلگی اور محنت و جفاکشی اختیار کرنے کی تلقین بھی کی ہے، اس لئے یہ مجموعہ عربی کے طلبہ کے لیے لائحہ عمل اور عربی درسگاہوں سے وابستہ افراد کے لئے ایمان، اخلاص، ایثار، علوے ہمت اور استغنا کا درس ہے، ہر تقریر میں فاضل خطیب کی دلسوزی، دردمندی اور ایمانی احساس نے بڑی کیفیت پیدا کر دی ہے، یہ تقریریں پہلے بھی چھپ چکی تھیں، مگر اب افادہ عام کے

خیال سے انکا مجموعہ شائع کیا گیا ہے، اس کے لئے انجمن طلباے قدیم ندوہ عام عربی مدارس کے طلبہ و اساتذہ کے شکریے کے مستحق ہیں۔

لینن۔ تصنیف رابرٹ کنکوئسٹ ترجمہ جناب جلیس عابدی صاحب تقطیع خورد، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۰۸ قیمت ۶ر نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری، مارکیٹ دریا گنج، دہلی،

اس میں لینن کی غیر معمولی، اور عہد ساز شخصیت کا مرقع اور اس کے حالات و خیالات اور افکار و اعمال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ شروع میں پس منظر کے طور پر اس عہد اور ماحول کا ذکر ہے، جس میں اس کی نشو و نما اور ذہنی پختگی ہوئی تھی پھر سامراج و سرمایہ داری کے خلاف اس کی جد و جہد، ۱۷ء کے روسی انقلاب میں اس کی سرگرمیوں حکمراں کی حیثیت سے اس کے زوال اور اس کے ان فکری و نظری اثرات کو بیان کیا گیا ہے، جو اس نے اپنے بعد چھوڑے تھے، آخر میں لینن کے بارہ میں اس کے پرستاروں کی مبالغہ آمیز رائیں اور اس پر لکھی گئی، بعض اہم کتابوں اور مضامین کی فہرست دیگئی ہے۔ اس کتاب میں لینن کے اصلی درجہ اور اس کی صحیح تصویر کو غیر جانبداری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اور اس کے واقعی کمالات اور حقیقی کارناموں کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ اور اس کی فکری و نظری خامیوں اور آمرانہ ذہنیت کو بھی دکھایا گیا ہے۔ اس سے اس کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا مختصر خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ نیشنل اکیڈمی کی دوسری مترجم کتابوں کی طرح اسکا ترجمہ بھی شگفتہ ہے۔

"ض"

……………

جلد ۱۱۴ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۴ء عدد ۳

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۱۶۲-۱۶۴

مقالات

عہد ہشام کا سندھ (۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ) — جناب ڈاکٹر عبد الباری لکچرار شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — ۱۶۵-۱۸۰
حدیث کا درایتی معیار (داخلی نقد حدیث) — جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ — ۱۸۱-۱۹۹
تاج محل کی تعمیر اور استاد احمد لاہوری (تحقیق مزید کی روشنی میں) — مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے (رفیق دار المصنفین) — ۲۰۰-۲۲۱
جامع مسجد برہان پور کے کتبات — جناب مولوی معین الدین صاحب استاد اردو و فارسی سیواسدن کالج برہانپور — ۲۲۲-۲۳۳

ادبیات

غزل — جناب عروج زیدی — ۲۳۴-۲۳۵
" — جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری — ۲۳۵
" — جناب اکمل سندیلوی — ۲۳۵-۲۳۶
" — جناب رفیع الدین احمد صاحب سالک حجازی — ۲۳۶
مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۲۳۷-۲۴۰